www.KitaboSunnat.com
اللہ کی نشانیاں
مصنف : ہارون یحییٰ
مترجم : ڈاکٹر تصدق حسین راجا

خالقِ کائنات کی زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی لاتعداد نشانیاں اور ان کا جدید سائنسی تحقیقات کی رُو سے مدلّل ثبوت۔ ایک نادر اور بے مثال کتاب کا پہلی بار اُردو ترجمہ۔

(ALLAH IS KNOWN THROUGH REASON)

مصنّف : ہارُون یحییٰ

مترجم : ڈاکٹر تصدّق حُسین راجا

اسلامک ریسرچ سینٹر۔ پاکستان

اللہ کی نشانیاں

اشاعت اوّل: شعبان ۱۴۲۱ھ، نومبر ۲۰۰۰ء

باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمٰن

قیمت : روپے

واحد تقسیم کار ادارۂ اسلامیات

☆ دینانا تھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔

فون: ۷۳۲۴۴۱۲ فیکس: ۹۲-۴۲-۷۳۲۴۷۸۵

☆ ۱۹۰۔ انار کلی، لاہور۔

فون: ۷۳۵۳۲۵۵-۷۲۳۳۹۹۱

☆ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی۔

فون: ۷۷۲۲۴۰۱

E-mail: idara@brain.net.pk
E-mail: islamiat@lcci.org.pk

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، دار العلوم، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دار العلوم، دار العلوم، کراچی نمبر ۱۴
دار الاشاعت، اردو بازار کراچی نمبر ۱
بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، انار کلی، لاہور۔

فہرست

کتاب اوّل: حقیقت تخلیق: سائنسی ثبوت کی روشنی میں

کتاب دوئم: وہ لوگ جو تخلیق کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جو تتلیوں کے پروں پر بھی پھول کاڑھتا ہے
یہ لوگ کہتے ہیں اس کی کوئی نشانی نہیں

عہدِ موجود خواب اور خبر کی یکجائی کا بلکہ صحیح تر معنوں میں انسان کی بے خبری کے اعتراف کا دور ہے۔ بیسویں صدی اور بالخصوص اس کے آخری ربع میں انسان کی تیز رفتار علمی پیش قدمی اور وسیع ہوتی ہوئی معلومات نے انسان کی لاعلمی کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔ گزرتا ہوا ہر پل ان کڑیوں کو باہم مربوط کر رہا ہے جو ایک عظیم ڈیزائنر اور لازوال خالق کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ایک عظیم معمے (JIGSAW PUZZLE) کی طرح معلومات کے ٹکڑے اس تصویر میں اپنی اپنی جگہ تیزی سے بیٹھ رہے ہیں جو خاک کے حقیر ترین ذرّے کے باطن سے لے کر کہکشاؤں کے پیچیدہ نظام تک کو محیط ہے۔ جدید ترین سائنسی اکتشافات وایجادات ہر آن خالق کائنات کی نشانیوں کو انسان کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ کھلتی ہوئی ہر پرت اور اترتا ہوا ہر غلاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ یہ بے مثال نظام اس سے کہیں عمیق اور کہیں پیچیدہ ہے جتنا انسان ابتدا سے سمجھتا تھا۔ اس حیرت سرا میں کھلنے والا ہر دروازہ ایک نئے جہان کی خبر دیتا ہے اور اس اعتراف کے بنا کوئی چارہ نہیں کہ انسان ابھی اس جہان کی صرف دہلیز پر کھڑا ہے۔

"اللہ کی نشانیاں" (Allah is known through reason) اسی حیرت سرا کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ انتہائی خوبصورت اور بے مثل کتاب ہمارے ادارے سے شائع ہونے والی ہارون یحیٰی کی دوسری کتاب ہے۔ اردو زبان میں ان موضوعات پر جو کام اب تک ہوا تھا وہ یا تو ان حضرات کی تحریروں پر مبنی تھا جو سائنسی علوم سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے یا سائنس کے ان معتقدات پر مشتمل تھا جنہیں خود سائنس چھوڑ کر یا ان کی بنیاد پر عمارت استوار

کر کے آگے بڑھ چکی ہے۔ ایسے میں ہارون یحییٰ کی یہ تصانیف اسلامی کتب کی دنیا میں ایسا وقیع اضافہ ہیں جن کی مثال کم از کم اردو ذخیرے میں دستیاب نہیں ہے۔ ان کتب کی خصوصیات میں مصنف کا مضبوط عقیدہ' طریقہء استدلال' جدید ترین علوم تک رسائی اور پرتاثیر اندازِ بیان وہ عناصر ہیں جنھوں نے ان کتب کو غیر معمولی حیثیت دے دی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ مصنف کی جانب سے خصوصی اجازت کے بعد ہمیں ان کتب کے اردو' انگریزی ایڈیشن پاکستان میں طبع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ ہماری بھرپور کوشش رہی ہے کہ یہ کتب بین الاقوامی معیار طباعت پر شائع کی جا سکیں اور الحمدللہ ترجمے' کاغذ' طباعت اور جلد بندی کے شعبوں میں یہ کاوش نمایاں طور پر کامیاب نظر آتی ہے۔ یہ معیار اسلامی کتب میں پہلی بار حاصل کیا گیا ہے اور ہمیں اس میدان میں اوّلیت کا شرف حاصل کرنے کی بے حد مسرت ہے۔ ان کتب میں جدید طرزِ تفہیم اور موضوع کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے جا بجا تصویروں، نقشوں اور خاکوں کے ذریعے بات واضح کی ہے۔ یہ انداز یقیناً موضوع تک کامل رسائی میں مفید اور مددگار ہوتا ہے۔ ان تصاویر وغیرہ میں سے جو بے جان اشیاء پر مشتمل ہیں' ان سب کو موجودہ اردو ایڈیشن میں برقرار رکھا گیا ہے۔ دیگر تصاویر وغیرہ کے بارے میں کئی ایک صاحب الرّائے حضرات سے متعدّد بار مشوروں کے بعد یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ جو تصاویر ناگزیر نہیں تھیں (مثلاً سائنس دانوں کی تصاویر) انہیں شامل نہیں کیا گیا اور جن تصاویر کے بارے میں یہ محسوس ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں کتاب کی افادیت متاثر ہوگی اور بات سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی انہیں شامل رکھا گیا۔ چونکہ اس کا مقصد صرف حقائق کو درست طور پر سمجھنا اور سمجھانا ہے اس لئے امید ہے کہ اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا۔

ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف' مترجم اور ناشرین کی اس کوشش کو قبول اور مقبول فرمائے اور اس میں موجود کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

ناشرین

کچھ مصنف کے بارے میں

اس کتاب کے مصنف نے اپنے قلمی نام ہارون یحیٰ کے استعمال کے ساتھ بہت سی سیاسی اور مذہبی کتب لکھیں جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔ اس کا زیادہ کام اس مادہ پرستانہ عالمی نقطۂ نظر سے متعلق ہے جو عالمی تاریخ و سیاسیات پر اثر انداز ہوا ہے۔ (اس قلمی نام کی تشکیل دو ناموں کو ملا کر ہوئی ہے "ہارون" (Aaron) اور "یحیٰ" (John)۔ یہ دونوں نام ان دو پیغمبرانِ خدا کی یاد تازہ کرتے ہیں جنہوں نے کفر و شرک کے خلاف جنگ لڑی)۔

ہارون یحیٰ کی دیگر تصانیف میں "یہودیت اور فری میسنری"۔ "فری میسنری اور سرمایہ داری" "ابلیس کا مذہب: فری میسنری"۔ "یہوداہ کے بیٹے اور فری میسنز"۔ "نیا میسنی نظام" "بوسنیا میں خفیہ ہاتھ"۔ "مکمل تباہی کا جھانسہ"۔ "دہشت گردی کے واقعات کے پیچھے"۔ "اسرائیل ......ایک کردی پتا"۔ "ترکی کے لئے قومی حکمت عملی"۔ "تباہ شدہ اقوام"۔ "عقل والوں کے لئے"۔ "خلیہ۔ ایک نشانی"۔ "نظام ماموئیت۔ ایک نشانی"۔ "انسانی آنکھ۔ ایک نشانی"۔ "مکڑی۔ ایک نشانی"۔ "مچھر۔ ایک نشانی"۔ "چیونٹی۔ ایک نشانی"۔ "حیات دنیا کی حقیقت"۔

مصنف نے کچھ کتابچے بھی لکھے جن کے نام یہ ہیں:

"راز ہائے ایٹم"۔ "نظریۂ اِرتقاء کی موت"۔ "حقیقت تخلیق"۔ "مادے کی موت"۔ "اِرتقاء پسندوں کی فاش غلطیاں اوّل"۔ "اِرتقاء پسندوں کی فاش غلطیاں دوئم"۔ "اِرتقاء کی خورد حیاتیاتی موت"۔ "نظریۂ اِرتقاء کی موت بیس سوالات میں"۔ "ڈارونیت: تاریخ حیاتیات میں سب سے بڑا فریب"۔

مصنف کے دیگر تصنیفی کام کے قرآنی موضوعات درج ذیل ہیں:

"سچائی کے بارے میں جو کبھی سوچا گیا"۔ "اللہ کے لئے وقف"۔ "جہالت کے معاشرے سے ترک تعلق"۔ "جنت"۔ "نظریۂ اِرتقاء"۔ "قرآن اور اخلاق حسنہ پر مبنی اقدار"۔ "قرآنی علم"۔ "قرآن کا اشاریہ"۔ "اللہ کی خاطر ہجرت"۔ "قرآن اور منافقین کا کردار"۔ "منافقین کے راز"۔ "اللہ کی صفات"۔ "قرآن میں پیغام کی ترسیل اور اس پر حجت"۔ "قرآن کے اساسی نظریات"۔ "قرآن کی روشنی میں جوابات"۔ "حیات بعد از ممات اور جہنم"۔ "پیغمبروں کی جدوجہد"۔ "انسان کا کھلا دشمن: ابلیس"۔ "بت پرستی"۔ "جاہل کا مذہب"۔ "ابلیس کا غرور و تکبر"۔ "قرآن اور نماز"۔ "قرآن اور انسان کا باطن"۔ "یوم حشر"۔ "مت بھولئے"۔ "قرآن کے فیصلے جو نظر انداز کئے گئے"۔

کتاب اوّل

تعارف

آپ جہاں کہیں بھی بیٹھے ہوں اگر آپ اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ کمرے کی ہر شے "بنائی گئی ہے": دیواریں، اسبابِ خانہ، چھت، کرسی جس پر آپ براجمان ہیں، کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، میز کا شیشہ اور بیشمار دوسری چیزیں جو اس کمرے میں موجود ہیں۔ ان اشیاء میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی نہ ہوگی جو از خود بن گئی ہو۔ یہاں تک کہ کمرے میں بچھی قالین کا دھاگہ بھی کسی نہ کسی نے ضرور بنایا ہوگا۔ نہ تو یہ سب از خود اچانک وجود میں آ گئے نہ محض اتفاق کے نتیجے میں بن گئے۔

جب کوئی شخص ایک کتاب کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہ بات اس کے علم میں ہوتی ہے کہ اسے کسی مصنف نے ایک خاص مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ وہ بھول کر بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ کتاب اتفاق سے وجود میں آ گئی ہوگی۔ اسی طرح ایک شخص کی نظر جب کسی مجسمے پر پڑتی ہے تو اسے اس کے بارے میں ذرہ بھر بھی یہ شک وشبہ نہیں ہوتا کہ اسے کسی مجسمہ ساز نے بنایا ہے وہ اسے محض ایک فن پارہ نہیں سمجھتا: اینٹیں بھی ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوں تو دیکھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کسی نے ایک منصوبے کے تحت ان کو اس طرح رکھا ہوگا۔ چنانچہ ہر کہیں، جہاں بھی چھوٹی یا بڑی کوئی ترتیب اور نظم دکھائی دے تو سمجھ لیا جائے کہ اس کا بانی اور محافظ ضرور موجود ہوگا۔ اگر کسی روز ایک شخص آئے اور یہ اعلان کر دے کہ خام لوہے اور کوئلے نے اتفاقاً باہم مل کر فولاد بنا دیا ہے جس سے اتفاقاً ایفل ٹاور تعمیر ہو گیا ہے ...... تو وہ شخص اور جو اس شخص پر یقین کرنے لگے ہوں کیا آپ انہیں دیوانہ اور فاتر العقل نہ تصور کریں گے؟

نظریۂ اِرتقاء کا دعویٰ، جو اللہ کی ذات سے انکار کا انوکھا طریقہ ہے اس سے مختلف تو نہیں

ہے۔ اس نظریے کے مطابق سالمے اتفاقاً امینوترشوں میں متشکل ہو گئے تھے، امینوترشوں نے اتفاقاً لحمیات کی شکل اختیار کر لی تھی اور ایک بار پھر لحمیات نے حتمی طور پر اتفاقاً جاندار خلیوں کی صورت اختیار کر لی ہوگی۔ تاہم انطباق کے نتیجے میں ایک جاندار مخلوق کے وجود میں آ جانے کا امکان ایفل ٹاور کے اسی طرح وجود میں آ جانے کے امکان کے مقابلے میں کم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سادہ سا انسانی خلیہ دنیا میں انسان کے ہاتھوں سے تعمیر کئے گئے کسی ڈھانچے کی نسبت زیادہ نفیس ہے۔

یہ سوچنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں توازن محض انطباق یا اتفاق سے پیدا ہوا جبکہ فطرت کی غیر معمولی ہم آہنگی کو انسانی آنکھ بغیر کسی عینک کی مدد کے دیکھ سکتی ہے؟ یہ کس قدر غیر استدلالی بات ہے کہ یہ کائنات جس کا ایک ایک ذرہ، ایک ایک شے اپنے خالق کی گواہی دے رہی ہے، اس کے بارے میں کوئی یہ کہے کہ یہ از خود وجود میں آ گئی۔

چنانچہ کائنات کے اس اعتدال و توازن کا جو ہمیں ہر کہیں نظر آتا ہے، ہمارے جسم سے لے کر وسعت نظر اور حد نگاہ سے بہت آگے تک کوئی نہ کوئی مالک ضرور ہونا چاہئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کون ہے وہ خالق جس نے اس کائنات کی ہر شے کو اس قدر نفیس اور باریک بنت کے ساتھ وجود میں آ جانے کا حکم دیا اور یوں اسے تخلیق کر دیا؟ وہ یقیناً اس کائنات کے اندر موجود کوئی مادی وجود رکھنے والا خالق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کی ذات کا اس کائنات کے وجود میں آنے سے قبل موجود ہونا ضروری ہے جس نے اپنے ارادے اور نیت سے اسے تخلیق کیا ہو۔ وہ خالق عظیم وہ ہے جس میں اس جہاں کی ہر شے اپنا وجود دیکھتی ہے اور جس کی ذات کی اپنی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہا۔

دین ہمیں اپنے خالق کی پہچان سکھاتا ہے، جس کی ذات کی موجودگی کی دریافت ہم اپنے استدلال سے کرتے ہیں۔ اس نے دین کی صورت میں جو ہم پر منکشف کیا ہے اس کے ذریعے ہم یہ جان پاتے ہیں کہ وہ اللہ ہے، نہایت مہربان اور رحم والا، جس نے آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود بخشا۔

بیشک کچھ لوگ اس حقیقت تک آسانی سے پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر وہ اپنی پوری زندگیاں اس سے بے خبر گزار دیتے ہیں۔ جب کبھی وہ کسی خوبصورت منظر کو رنگوں کی آمیزش سے تیار کردہ تصویر کی شکل میں دیکھتے ہیں تو سوچنے لگ جاتے ہیں کہ اس کا مصور کون ہے؟۔ پھر معلوم

ہو جانے پر وہ اس خوبصورت فن پارے کے خالق مصوّر کی جی بھر کے تعریف کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس تصویر کے اصل، قدرتی مناظر کی شکل میں بیشمار موجود ہیں مگر ان سب پر مڑ کر نظر ڈالنے کے باوجود وہ اس اللہ کی ذات کی موجودگی کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو تنہا و یکتا ان تمام خوبصورتیوں اور رعنائیوں کا مالک ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کی ذات کو سمجھنے کے لئے کوئی طویل تحقیق ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص پیدائش سے لے کر آخر تک ایک ہی کمرے میں اکیلا رہتا رہا ہو تو اس کمرے کے اندر کی مختصر سی دنیا اس کے لئے یہ سمجھنے کو کافی ہو گی کہ اللہ کی ذات موجود ہے۔

خود انسانی جسم کے اندر ثبوت اور شواہد اس قدر جمع ہیں کہ اتنے تو کئی جلدوں پر مشتمل کسی انسائیکلوپیڈیا میں بھی نہ ہوں گے۔ اگر کوئی اسے چند منٹ بھی غور و فکر کے لئے دے سکے تو اسے یقین دلانے کو اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ موجود ہے۔ موجودہ نظام اللہ کی حفاظت میں ہے اور وہی اسے قائم و دائم رکھے ہوئے ہے۔

صرف انسانی جسم ہی انسان کے لئے غور و فکر کے دریچے وا نہیں کرتا ہے بلکہ زمین کے ہر مربع ملی میٹر میں زندگی بستی ہے، خواہ وہ انسانوں کو نظر آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ اس دنیا میں جانداروں کا ایک بحرِ بیکراں موجزن ہے، یک خلوی سالموں سے پودوں تک، کیڑے مکوڑوں سے سمندری جانوروں تک اور پرندوں سے انسانوں تک۔ اگر آپ مٹھی بھر مٹی لے لیں اور اسے بغور دیکھیں تو اس کے اندر بھی آپ کو قسم قسم کے جاندار نظر آئیں گے جو اپنی اپنی ذات میں مختلف صفات رکھتے ہوں گے۔ یہی بات اس ہوا پر بھی صادق آتی ہے جس میں آپ سانس لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے جسم پر موجود جلد پر بھی بہت سے جاندار موجود ہوتے ہیں جن کے ناموں تک سے آپ واقف نہیں ہیں۔ تمام جانداروں کی انتڑیوں میں کئی ملین جرثومے یا یک خلوی سالمے ہوتے ہیں جو نظام ہضم میں مدد دیتے ہیں۔ دنیا میں انسانوں کی تعداد کی نسبت جانوروں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے۔ جب ہم پودوں کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جس پر زندگی موجود نہ ہو۔ یہ ساری مخلوق جو کئی ملین مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اس کے اجسام کے نظام جدا جدا ہیں، ان کی زندگیاں مختلف ہیں اور وہ ارضیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں مختلف کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب اتفاقاً بغیر کسی مقصد و غایت کے وجود میں آ گئے ہیں یا دنیا کی کوئی بھی جاندار شے اپنے آپ یا اپنی کوشش

سے وجود میں آئی ہے اور کوئی بھی انطباقی یا اتفاقی واقعہ ایسے پیچیدہ نظاموں کے اندر سامنے آسکتا ہے۔

یہ ثبوت ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ کائنات ایک خاص ''شعور وآگہی'' کے تحت تخلیق ہوئی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شعور وآگہی کا منبع و ماخذ کیا ہے؟ یقیناً یہ اس کے اندر بسنے والی جاندار یا بے جان مخلوق میں سے کوئی نہیں ہوسکتا۔نہ ہی یہ ان میں سے کوئی ایسا ہے جو ہم آہنگی پیدا کرتا اور نظم و ترتیب کو برقرار رکھتا ہے۔اللہ کی موجودگی اور عظمت وجلال کائنات کی بیشمار نشانیوں میں سے ٹپکتا ہے۔دراصل اس روئے زمین پر ایک انسان بھی ایسا نہیں جو تہ دل سے اس عیاں حقیقت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔

پھر بھی وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ان کے دل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں مگر وہ خود نخوت و کبر کا شکار ہو کر اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔قرآن حکیم میں ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ط

''انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے''۔(سورۃ النمل:۱۴)

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس حقیقت کو لوگوں تک پہنچایا جائے جس سے کچھ لوگ محض اس لئے اغماض برتتے ہیں کہ اس سے ان کے مفادات (دنیاوی مفادات) پر ضرب کاری لگتی ہے۔اس تصنیف کے ذریعے وہ دھوکہ و فریب اور احمقانہ طور پر اخذ کردہ نتائج بھی سامنے لائے جائیں گے جن پر کچھ غلط و نادرست دعووں اور حجتوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔اسی سبب سے زیر نظر کتاب میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

اس کتاب کے قارئین ایک بار اور یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا غیر نزاعی ثبوت پیش کیا گیا ہے اور وہ ملاحظہ کریں گے کہ اللہ جل شانہٗ کس طرح کائنات کی ہر شے کو محیط کئے ہوئے ہے اور یہ ''استدلال'' کے دائرے کے اندر آتا ہے۔جس طرح اس خالق کائنات نے پورے عالم پر محیط یہ نظام تخلیق کیا اسی طرح وہی ہے جو اسے پیہم برقرار رکھے ہوئے ہے اور تاقیامت بدستور قائم رکھے گا۔

عدم سے وجود تک

یہ سوالات ہمیشہ سے دلچسپی کے موضوعات بنے رہے ہیں کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی، یہ کس سمت رواں دواں ہے، اوراس کے نظام اورتوازن کو برقرار رکھنے والے قوانین کیا ہیں۔ سائنسدانوں اور مفکرین نے اس موضوع پر بڑے غور وفکر کے بعد چند ایک نظریات وضع کئے ہیں۔

بیسویں صدی تک عام خیال یہ کیا جاتا تھا کہ اس کائنات کی لامحدود وسعتیں ہیں اور یہ ازل سے ہے اورتاابد قائم رہے گی۔اس نظریے کے مطابق جسے ''جامد وبے تغیر کائنات کا نمونہ'' کہا جاتا تھا،اس کائنات کا نہ تو کوئی آغاز تھا نہ ہی اختتام۔

مادہ پرست فلسفے کے لئے زمین ہموار کرتے ہوئے اس نظریے نے خالق کے وجود سے انکار کیا اور یہ تصور پیش کیا کہ یہ کائنات مادے کا ایک مستقل، مستحکم اور غیر متبدل مجموعہ ہے۔

مادہ پرستی ایک ایسا نظام فکر ہے جو مادے کو ایک مستقل شے سمجھتا ہے اور ماسوا مادے کے ہر شے کے وجود سے انکار کرتا ہے۔اس نظام فکر کی جڑیں یونان میں ہیں، جو انیسویں صدی میں بڑی تیزی کے ساتھ عام ہوا۔اور اسے کارل مارکس کے استدلالی نظریہ مادہ پرستی سے بڑی شہرت ملی۔

جیسا کہ ہم ابتداء میں بتا چکے ہیں کہ اس جامد وغیر متغیر کائنات کے نمونے نے انیسویں صدی میں مادہ پرستی کے فلسفے کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ جارج پولائزر اپنی کتاب "Principes Fondamentaux de Philosophie" میں اس کائنات کے ماڈل کی بنیاد کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''یہ کائنات کوئی تخلیق شدہ شے نہیں تھی''۔اس نے مزید کہا کہ: یہ کائنات تخلیق شدہ شے نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خدا نے اسے آناً فاناً تخلیق کیا ہوتا اور اسے عدم سے وجود

میں لے آیا ہوتا۔ تخلیق کو تسلیم کر لینے کے پہلے مرحلے میں تو اس لمحے کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا جب یہ کائنات وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور پھر یہ بات کہ کوئی شے عدم سے وجود میں آگئی۔ ایسی بات ہے جسے سائنس نہیں مانتی۔

جب پولائزر نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ کائنات عدم سے تخلیق نہیں کی گئی تھی تو وہ دراصل انیسویں صدی کی جامد و غیر متغیر کائنات کے ماڈل پر انحصار کر رہا تھا۔ اسے خیال یہ گزرا کہ وہ ایک سائنسی دعویٰ پیش کر رہا ہے۔ تاہم بیسویں صدی کی ترقی پذیر سائنس اور ٹیکنالوجی نے اس طرح کے قدیم نظریات منسوخ کر دیئے تھے کہ جامد و غیر متغیر کائنات کے ماڈل نے مادہ پرستوں کے لئے زمین ہموار کی ہے۔ آج جب ۲۱ ویں صدی کی آمد آمد ہے، جدید طبیعات نے بہت سے تجربات، مشاہدات اور تجزیات کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کائنات کی ایک ابتداء تھی اور اسے ایک بہت بڑے دھماکے کے ساتھ عدم سے تخلیق کیا گیا تھا۔

کائنات کی ابتداء سے مراد یہ ہے کہ یہ عالم کون و مکان عدم سے وجود میں لایا گیا تھا، یعنی اسے تخلیق کیا گیا تھا۔ اگر ایک تخلیق شدہ شے اپنا وجود رکھتی ہے (جو اس سے قبل موجود نہ تھی) تو پھر اس کا کوئی خالق ضرور ہوگا۔ عدم سے وجود میں آنے والی بات انسانی ذہن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (انسان عملاً اس کا ادراک اس لئے نہیں کر سکتا کیونکہ وہ کبھی اس طرح کے تجربے سے نہیں گزرا) اس لئے عدم سے وجود میں آنا مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی شے بنانے کی نسبت ایک بہت مختلف بات ہے۔ (مثلاً فن کے نمونے یا فنیاتی ایجادات) تخلیق شدہ اشیاء کے لئے یہ اللہ کی ایک نشانی ہے کہ ہر شے کو اچانک اور جامع شکل میں ایک لمحے بھر میں تخلیق کیا گیا۔ ان تخلیق شدہ اشیاء کی اس سے پہلے کوئی مثالیں موجود نہ تھیں نہ ہی زمان و مکان کا کوئی وجود تھا جن میں انہیں تخلیق کیا جا سکتا۔

کائنات کا عدم سے وجود میں آنا وہ سب سے بڑا ممکنہ ثبوت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو بہت سی چیزیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس سے لوگوں کو زندگی کے معانی جاننے اور اپنے رویوں اور مقاصد پر نظر ثانی کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے سائنسدانوں نے اس تخلیق کی حقیقت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے جسے وہ پوری طرح سمجھ ہی نہ سکے حالانکہ اس کا ثبوت ان پر واضح تھا۔ اس حقیقت کی بنا پر سائنسدانوں کو لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے کے لئے متبادل باتیں ایجاد کرنا پڑیں تاکہ ان کے ذہنوں کو اس حقیقت سے دور لے جاسکیں کہ ایک خالق کی موجودگی ثابت کرنے کے لئے

سائنسی ثبوت موجود ہیں۔ مگر خود یہ سائنسی ثبوت ان نظریات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔

آیئے اب ہم اس سائنسی پیش رفت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں کہ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی۔

کائنات کی توسیع

یہ ۱۹۹۲ء کا واقعہ ہے کہ کیلیفورنیا ولسن رصدگاہ میں ایک امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے تاریخ فلکیات میں ایک بہت بڑی دریافت کی۔ جس وقت وہ ایک بہت بڑی دُور بین سے ستاروں کا مشاہدہ کر رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ان ستاروں سے پھوٹنے والی روشنی، طیف (Spectrum) کے سرخ کنارے کی جانب منتقل ہوگئی اور یہ روشنی زمین سے بہت نمایاں طور پر دیکھی گئی تھی۔ اس دریافت نے دنیائے سائنس پر ایک بجلی دوڑا دینے والا اثر کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طبیعات کے مسلمہ اصولوں کے مطابق روشنی کی کرنوں کے طیوف (Spectra) جو مشاہدے کے مقام کی جانب سفر کر رہے تھے وہ اس وقت بنفشی ہو گئے تھے جس وقت روشنی کی کرنوں کے طیوف جو مشاہدے کے مقام کی جانب سفر کر رہے تھے سرخی مائل ہو گئے تھے۔ ہبل کے مشاہدات کے دوران ستاروں سے پھوٹنے والی روشنی کے بارے میں یہ دریافت کیا گیا کہ وہ سرخی مائل ہو رہی ہے۔ اس سے یہ مراد تھی کہ وہ مسلسل ہم سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

ہبل نے جلد ہی ایک اور نہایت اہم دریافت کی: ستارے اور کہکشائیں نہ صرف ہم سے دور ہوتی جاتی ہیں بلکہ ان کے اپنے درمیان فاصلہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ایسی کائنات جس میں ہر شے ایک دوسرے سے دور ہٹتی جاتی ہے اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کائنات میں مسلسل ''توسیع'' ہوتی جا رہی ہے۔ دراصل یہ بات کچھ اور پہلے نظری طور پر دریافت کی جا چکی تھی۔ البرٹ آئن سٹائن جسے صدی کا عظیم ترین سائنسدان تصور کیا جاتا ہے نظری طبیعات میں مختلف جائزوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ کائنات جامد و غیر متغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم اس نے اپنی اس دریافت کو محض اس وجہ سے دفن کر دیا تھا کہ وہ اپنے عہد کے اس وسیع نقطہ نظر سے متصادم نہیں ہونا چاہتا تھا کہ کائنات جامد و غیر متغیر ماڈل ہے۔ آئن سٹائن کو بعد ازاں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس کا یہ فعل اس کے ''پیشہ ورانہ عرصے کی سب سے بڑی غلطی تھی'' آخرکار ہبل کی دریافتوں نے یہ بات حتمی طور پر منوالی تھی کہ کائنات میں توسیع ہو رہی ہے اور یہ جامد و غیر متغیر نہیں ہے۔

یہاں مختلف کہکشاؤں کے درمیان طویل فاصلے کو دکھایا گیا ہے۔ نیز یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ کس حد تک سرخی کی جانب مائل ہیں۔ سب سے اوپر جو عمودی لکیر دکھائی گئی ہے وہ طیف پر ایک خاص نقطے کی نشاندہی کرتی ہے۔ دوسری طیوف میں یہ نقطہ دائیں طرف جھکا ہوا ہے جو افقی تیر کے نشان تک پہنچ گیا ہے۔ سرخی کی جانب جھکاؤ جو دُوری کو ظاہر کرتا ہے، جوں جوں کہکشاں زمین سے دور ہوتی جاتی ہے، بڑھتا جاتا ہے۔
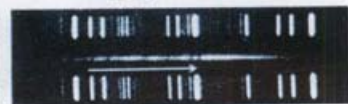
سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس حقیقت کی وجود کائنات کے حوالے سے کیا اہمیت بنتی ہے کہ کائنات میں توسیع ہو رہی ہے؟

کائنات کی توسیع سے مراد یہ تھی کہ جب بھی پیچھے کی سمت سفر کیا جائے تو کائنات یہ ثابت کر دیتی ہے کہ یہ ایک واحد نقطے سے وجود میں آئی تھی۔

ان جائزوں نے یہ بات منکشف کی کہ یہ ''واحد نقطہ'' جس نے کائنات کے تمام مادے کو پناہ دے رکھی تھی اس کا ''صفر حجم'' ہونا چاہئے تھا اور ''لامحدود کثافت''۔ یہ کائنات اس واحد نقطے کے دھماکے کے ساتھ پھٹنے سے وجود میں آئی، جس نقطے کا صفر حجم تھا۔ اس عظیم دھماکے کو ''بگ بینگ'' (Big Bang) کا نام دیا گیا جس سے اس کائنات کی ابتداء ہوئی۔ اور اس نظریے کو بھی اسی نام سے موسوم کیا گیا۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ''صفر حجم'' ایک نظری اظہار ہے جو اس موضوع کی تشریح کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنس ''عدم'' کے تصور کی تشریح کر سکتی ہے جو انسانی سمجھ بوجھ کی حدود سے باہر ہے اور اسے ''ایک نقطہ صفر حجم کے ساتھ'' کے اظہار کے توسط سے ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت ''ایک نقطہ بغیر کسی حجم کے'' کے معنی ہیں ''عدم''۔ اور اسی عدم سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے تخلیق کیا گیا ہے۔

یہاں مختلف کہکشاؤں کے درمیان طویل فاصلے کو دکھایا گیا ہے۔ نیز یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ کس حد تک سرخی کی جانب مائل ہیں۔ سب سے اوپر جو عمودی لکیر دکھائی گئی ہے وہ طیف پر ایک خاص نقطے کی نشاندہی کرتی ہے۔ دوسری طیوف میں یہ نقطہ دائیں طرف جھکا ہوا ہے جو افقی تیر کے نشان تک پہنچ گیا ہے۔ سرخی کی جانب جھکاؤ جو دُوری کو ظاہر کرتا ہے، جوں جوں کہکشاں زمین سے دور ہوتی جاتی ہے، بڑھتا جاتا ہے۔

بگ بینگ نظریے نے یہ انکشاف کیا کہ ابتدائے آفرینش کے وقت کائنات کی تمام چیزیں باہم ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں جو پھر جدا جدا کر دی گئیں۔ قرآن پاک نے اس حقیقت کو جو بگ بینگ نے ظاہر کی، ۱۴۰۰ سو سال قبل اس وقت بیان کر دیا تھا جب اس کائنات کے بارے میں لوگوں کا علم بے حد کم تھا:

اَوَ لَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ۔

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟ (سورۃ الانبیاء: ۳۰)

جیسا کہ اس سورۃ میں بیان ہوا ہر شے حتیٰ کہ ''سب آسمان اور زمین'' جن کو ابھی تخلیق نہیں کیا گیا تھا ایک واحد نقطے سے ایک دھماکے کے ساتھ پیدا کر دیئے گئے تھے۔ یوں انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے اس کائنات کو ایک شکل دے دی گئی تھی۔

جب ہم ان بیانات کا جو اس قرآنی سورۃ میں آئے اس نظریہ بگ بینگ سے موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا تاہم یہ ضرور ہے کہ بگ بینگ کو بیسویں صدی میں آکر سائنسی نظریے کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔

تحقیق نے یہ بات ثابت کی ہے کہ ستارے اور کہکشائیں ہم سے اور ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کائنات پھیلتی ہے۔ یہ اس خیال کا اظہار ہے کہ جب ہم وقت میں پیچھے کی جانب سفر کرتے ہیں تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کی ابتداء ایک نقطے سے ہوئی۔

کائنات کا پھیلاؤ ایک ایسا اہم ثبوت ہے جو اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق عدم سے ہوئی۔ مگر سائنس ۲۰ ویں صدی تک اس حقیقت کو دریافت نہ کر سکی۔ اللہ نے اس حقیقت سے ۱۴۰۰ سو سال قبل قرآن حکیم کے ذریعے ہمیں اس طرح مطلع فرمادیا تھا:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ o وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ o

"آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں"۔ (الذّٰریٰت: ۴۷۔۴۸)

نظریہ بگ بینگ کی متبادل صورتوں کی تحقیق

نظریہ بگ بینگ سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اس کائنات کو "عدم سے تخلیق" کیا گیا تھا دوسرے لفظوں میں اسے اللہ نے تخلیق کیا۔ اسی وجہ سے وہ ماہرین فلکیات جو مادہ پرستانہ فلسفے سے گہری وابستگی رکھتے تھے انہوں نے نظریہ بگ بینگ کی مخالفت جاری رکھی اور کائنات کے بتدریج وجود میں آنے کے نظریے کو تھامے رکھا۔ اے ایس ایڈنگٹن نے جو صف اوّل کا مادہ پرست ماہر طبعیات تھا درج ذیل الفاظ میں اس کوشش کی وجہ بیان کی ہے:

"فلسفیانہ نقطۂ نظر کی رُو سے کائنات کا موجودہ شکل میں اچانک آغاز مجھے کبھی پسند نہیں آیا"۔

سر فریڈ ہائل ان لوگوں میں سے تھا جو بگ بینگ نظریے سے پریشان ہو گئے تھے۔ صدی کے وسط میں ہائل نے بتدریج وجود میں آنے کے نظریے کو عام کرنے کی کوشش کی جو کم و بیش ۱۹ ویں صدی کے "جامد و غیر متغیر" نظریے سے ملتا جلتا تھا۔ کائنات کے بتدریج وجود میں آنے کے نظریے نے دلیل یہ پیش کی کہ کائنات حجم میں لامتناہی اور عرصہ و مدت میں دائمی تھی۔ اس کا واحد مقصد مادہ پرستانہ فلسفے کی حمایت نظر آتا ہے۔ یہ نظریہ مکمل طور پر "بگ بینگ" نظریے کے
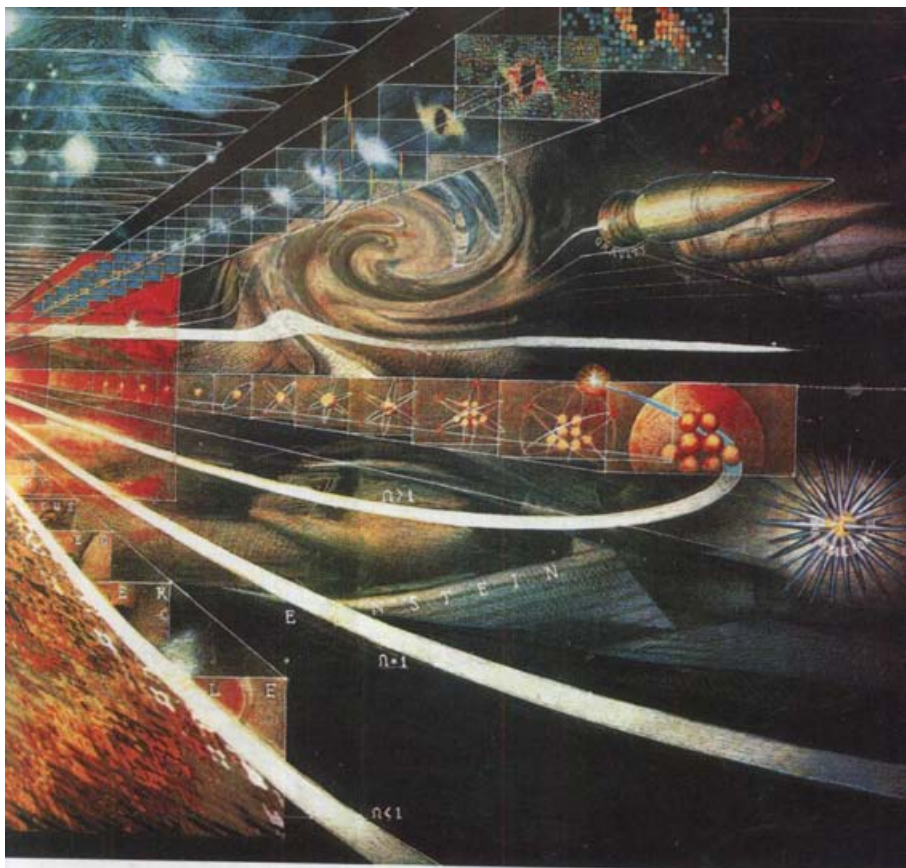
خلاف تھا جس کی رُو سے اس کائنات کی ایک ابتداء ہے۔

وہ لوگ جو کائنات کے بتدریج وجود میں آنے کے نظریے کی حمایت کرتے تھے، انہوں نے ایک طویل عرصے تک بگ بینگ کی مخالفت کی۔ مگر سائنس ان کے خلاف کام کر رہی تھی۔

دوسری جانب کچھ سائنسدان متبادل صورتوں کی تلاش میں تھے۔

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے کہ George Gamov نے بگ بینگ سے متعلق ایک اور تصور پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک دھماکے سے اس کائنات کے وجود میں آجانے کے بعد دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آنے والی کائنات میں ایک اشعاعی زائد موجود ہونا چاہئے تھا مزید یہ کہ اس اشعاعی زائد کو پوری کائنات میں یکساں طور پر پھیل جانا چاہئے تھا۔ یہ ثبوت جسے ''موجود ہونا چاہئے تھا''، اسے جلد تلاش کیا جانا باقی تھا۔
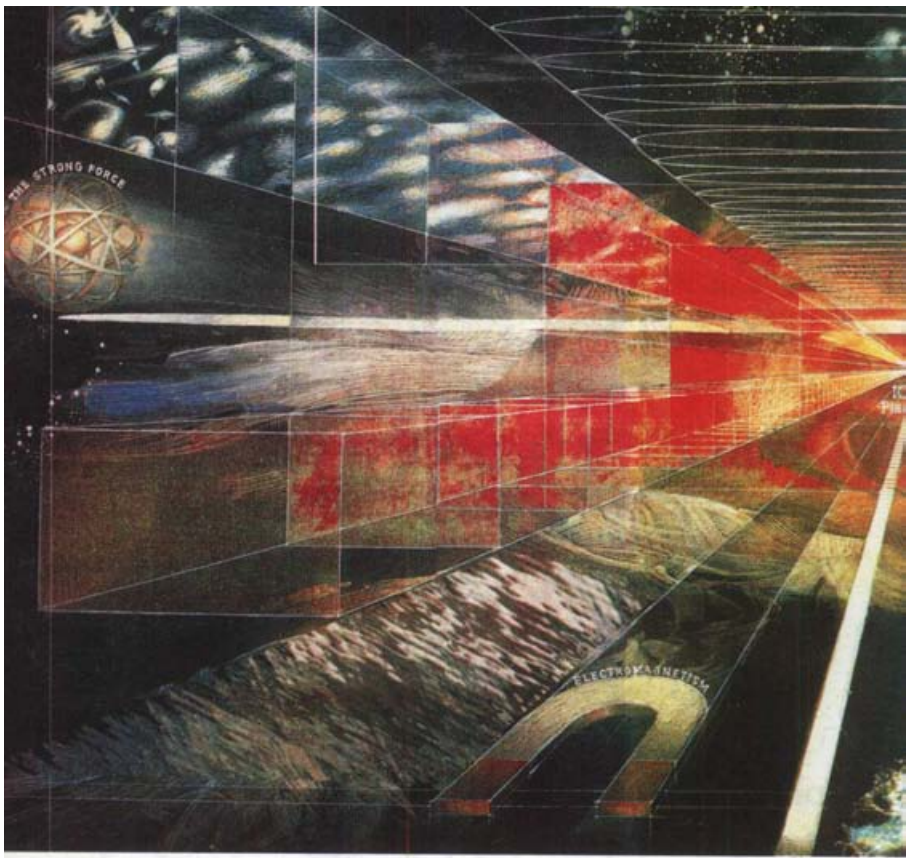
مزید ثبوت: کائنات میں اشعاعی پس منظر

یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے جب دو محققین ARNO PENZIS اور رابرٹ ولسن نے اتفاقاً ان لہروں کو دریافت کرلیا تھا۔ اس شعاع ریزی کو "کائنات میں اشعاعی پس منظر" کا نام دیا گیا۔ یہ کسی خاص منبع سے نکلتی نظر نہیں آتی تھی لیکن پورے کرۂ خلائی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ حرارت کی وہ لہریں جو پورے کرۂ خلائی سے یکساں طور پر نکل رہی تھیں وہ بگ بینگ کے ابتدائی مراحل میں اس کائنات میں رہ گئی ہوں گی۔ ان دونوں محققین کو اس دریافت پر نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔

۱۹۸۹ء میں ناسا (NASA) نے کائنات میں شعاع ریزی کے پس منظر پر تحقیق کے لئے کوبے (COBE) سیٹلائٹ خلاء میں بھیجا۔ اس سیٹلائٹ کو Penzis اور ولسن کی پیمائشوں کی

تصدیق اپنے حساس آلات کے ذریعے کرنے میں صرف آٹھ منٹ لگے تھے۔ کوبے (COBE) نے اس عظیم دھماکے کی باقیات تلاش کر لی تھیں، جو اس کائنات کی ابتداء کے وقت ہوا تھا۔

یہ تمام زمانوں کی عظیم ترین فلکیاتی دریافت قرار دی گئی تھی، جس نے بگ بینگ نظریے کو قطعی طور پر ثابت کر دیا تھا۔ کوبے سیٹلائٹ کے بعد کوبے:۲ (COBE-2) سیٹلائٹ نے بھی جسے کوبے: اسیٹلائٹ کے بعد خلاء میں بھیجا گیا تھا، بگ بینگ پر مبنی جائزوں کی تصدیق کر دی تھی۔

بگ بینگ کا ایک اور اہم ثبوت خلاء میں موجود ہائیڈروجن اور ہیلیم (Helium) کی مقدار تھی۔ آخری جائزوں میں یہ بات بھی علم میں آئی کہ کائنات میں ہائیڈروجن ہیلیم کا ارتکاز بگ بینگ سے بچ رہنے والی ہائیڈروجن ہیلیم کے ارتکاز کے نظری جائزوں کی مطابقت میں پایا گیا تھا۔ اگر اس کائنات کی ایک ابتداء نہ ہوتی اور یہ ازل سے موجود ہوتی تو اس صورت میں اس کا ہائیڈروجن کا ترکیبی جز و مکمل طور پر خرچ ہو کر ہیلیم میں تبدیل ہو گیا ہوتا۔

یہ تمام وہ یقین دلانے والے ثبوت تھے جنہوں نے سائنسدانوں کو نظریہ بگ بینگ کو تسلیم کر لینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ بگ بینگ ماڈل وہ آخری نکتہ تھا جس پر سائنس اس کائنات کی تشکیل اور ابتداء سے متعلق نظریے پر پہنچ چکی تھی۔

فریڈ ہائل نے کائنات کے نظریۂ تدریجی حالت کا دفاع برسوں کیا۔ Dennis Sciama نے حتمی صورت حال کا ذکر اس وقت کیا جب نظریہ بگ بینگ کے حق میں تمام ثبوت سامنے آ چکے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ نظریۂ تدریجی حالت کے حامیوں اور ان لوگوں کی گرما گرم بحثوں میں حصہ لیتا رہا تھا جنہوں نے اس نظریے کا محض اس خیال سے تجزیہ کیا تھا کہ اسے مسترد کر دینے کی توقع رکھتے تھے۔ اس نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ نظریۂ تدریجی حالت کا دفاع اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ وہ اسے درست تسلیم کرتا تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ کاش یہ درست نکلے۔ اس نظریے کے خلاف جوں جوں اعتراضات سامنے آتے گئے فریڈ ہائل نے ان سب کا مقابلہ کیا۔ Sciama کا کہنا ہے کہ پہلے تو اس نے بھی ہائل کا ساتھ دیا مگر جب ثبوت اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تو اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور اب نظریۂ تدریجی حالت کو خارج از بحث کر دیا جانا چاہیے۔

پروفیسر جارج ایبل جو کیلیفورنیا یونیورسٹی سے وابستہ ہے، کا کہنا ہے کہ وہ ثبوت جو اس وقت موجود ہے یہ انکشاف کرتا ہے کہ یہ کائنات کئی بلین برس قبل ایک دھماکے سے وجود میں آئی۔

اس کے خیال میں سوائے نظریہ بگ بینگ کو تسلیم کرنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔

بگ بینگ کی فتح و نصرت کے ساتھ ہی ''دائمی مادے'' کا نظریہ، جو مادہ پرستانہ فلسفے کو بنیاد فراہم کرتا تھا تاریخ کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بگ بینگ سے قبل کیا تھا اور وہ کون سی طاقت تھی جو اس کائنات کو اس وقت ایک بڑے دھماکے سے ''وجود'' میں لائی، جب یہ ''موجود نہ تھی''۔ یہ سوال یقیناً آرتھر ایڈنگٹن کے ان الفاظ کی دلالت کرتا ہے کہ یہ حقیقت ''فلسفیانہ طور پر مادہ پرستوں کے لئے ناقابل قبول ہے'' کہ ایک خالق ضرور موجود ہے۔ مشہور ملحد فلسفی انٹونی فلیو اس مسئلے پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

''یہ بات مشہور ہے کہ اعتراف حیات انسانی کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ میں اسی لئے اپنی بات کا آغاز اس اعتراف سے کروں گا کہ Stratonician منکر خدا کو معاصر کائناتی کثرتِ رائے سے پریشان ہو جانا چاہئے اس لئے کہ یوں لگتا ہے جیسے ماہرین علم کائنات ایک سائنسی ثبوت پیش کر رہے ہیں جسے سینٹ تھامس فلسفے کی بنیاد پر ثابت نہ کر سکا یعنی یہ کہ کائنات کی ایک ابتداء ہے جب تک اس کائنات کے بارے میں بڑے اطمینان کے ساتھ یہ تصور نہیں کر لیا جاتا کہ اسے ایک دن اختتام کو پہنچنا ہے بلکہ اس کی ایک ابتداء بھی ہے اس وقت تک یہ بات آسان نظر آتی ہے کہ یہ چاہا جائے کہ اس کائنات کا وجود اور وہ ذرہ ذرہ جو اس کے بنیادی خدوخال بناتا ہے اسے حتمی وضاحت کے طور پر مان لیا جائے حالانکہ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ ابھی تک صحیح اور درست ہے مگر یہ یقیناً نہ تو آسان ہے نہ ہی اطمینان بخش کہ بگ بینگ کہانی کی موجودگی میں اس یقین کو برقرار و بحال رکھا جا سکے۔

بہت سے ایسے سائنسدان جو اپنے آپ کو بلا سوچے سمجھے کفر و الحاد کے اندر محدود نہیں رکھتے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کو تخلیق کرنے والا ایک خالق ضرور ہے۔ وہ خالق ایک ایسی ہستی ہو سکتا ہے جس نے مادہ اور وقت دونوں تخلیق کئے ہوں اور پھر ان دونوں سے آزاد و ماوراء بھی ہو۔ ایک نامور ماہر فلکی طبیعات Hugh Ross اس حقیقت کا اظہار یوں کرتا ہے:

اگر وقت کا آغاز کائنات کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہوا جیسا کہ خلائی مسئلہ کہتا ہے تو پھر تو اس کائنات کے وجود میں آنے کا سبب ایک ایسی ہستی ہونی چاہئے جو مکمل آزادی کے ساتھ کسی وقت کے طول و عرض کے اندر کام کر رہی ہو اور جو وقت کائنات کے وقت کے طول و عرض سے آزاد بھی ہو اور پہلے سے موجود بھی ہو۔ یہ نتیجہ بڑی قوت کے ساتھ ہماری اس تفہیم کے لئے اہم

ہے کہ خدا کون ہے اور وہ کون یا کیا نہیں ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات بذاتِ خود اللہ نہیں ہے نہ ہی وہ کائنات کے اندر محدود ہے۔

مادہ اور وقت خالق عظیم وذوالجلال نے تخلیق کئے ہیں جو ان تمام تصورات سے بالاتر ہے۔

یہ خالق اللہ ہے آسمانوں اور زمین کا مالک۔

خلاء میں خوبصورت توازن

سچ تو یہ ہے کہ بگ بینگ نے جو پریشانی مادہ پرستوں کے لئے پیدا کی وُہ درج بالا منکر خدا فلسفی انٹونی فلیو کے اعترافات کی نسبت کہیں زیادہ ہے اس لئے کہ نظریہ بگ بینگ صرف یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ کائنات عدم سے وجود میں آئی بلکہ یہ کہ کائنات تو ایک نہایت سوچ سمجھے، کسی نظام کے تحت اور ضابطہ وکنٹرول میں رہ کر تخلیق کی گئی۔

بگ بینگ ایک نقطے کے دھماکے سے پھٹنے کے نتیجے میں ہوا جس نقطے کے اندر کائنات کا تمام مادہ اور توانائی رکھی ہوئی تھی اور جو خلاء میں تیزی کے ساتھ منتشر ہو گیا تھا۔ اس مادے میں سے، جو تمام سمتوں میں خوفناک رفتار کے ساتھ پھیل گیا تھا ایک ایسا توازن پیدا ہوا جس میں کہکشائیں، ستارے، سورج، زمین اور دیگر تمام اجرام فلکی شامل تھے۔ مزید یہ کہ ایسے قوانین تشکیل پا گئے تھے جنہیں ''قوانین طبیعات'' کہا گیا اور جو کائنات بھر میں ایک جیسے ہیں، اور کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ اس ساری تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بگ بینگ کے بعد ایک جامع ترتیب و نظم پیدا ہوئے۔

تاہم عام دھماکے ترتیب و نظم پیدا نہیں کرتے۔ دیکھنے میں آنے والے تمام دھماکے نقصان پہنچاتے، ٹکڑے ٹکڑے کرتے اور جو کچھ موجود ہو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے دھماکے، احتراق پذیر گیس کے دھماکے، آتش فشانی دھماکے، قدرتی گیسوں کے دھماکے، شمسی دھماکے: ان سب کے اثرات ونتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔

اگر ہم ایک دھماکے کے بعد کسی مفصل ترتیب و نظم سے متعارف کرائے جائیں مثلاً ایک ایک زمین دوز دھماکے سے نہایت جامع وخوبصورت فن کے نمونے باہر آ جائیں، بڑے بڑے محلات نکل آئیں یا پرشکوہ عمارات باہر آ جائیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی ''مافوق الفطرت ہستی'' ایسی ہے جو اس دھماکے، کے پس پردہ کام کر رہی ہے اور دھماکے سے جس قدر ٹکڑے بھی

پھیلے ان کو ایک نہایت غالب اور منصوبہ بند طریقے سے حرکت میں لایا گیا ہے۔

سر فریڈ ہائل نے کئی سال تک بگ بینگ کی مخالفت کی، پھر اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس صورت حال کو بڑے اچھے طریقے سے بیان کیا ہے:

"نظریۂ بگ بینگ کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات ایک واحد دھماکے کے ساتھ وجود میں آئی۔ تاہم جیسا کہ نیچے بیان کیا گیا ہے دھماکہ تو مادے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے جبکہ بگ بینگ نے متضاد نتیجہ پیش کیا ہے کہ مادے کے کہکشاؤں کی صورت میں جھنڈ کے جھنڈ نمودار ہو گئے ہیں"۔

جب وہ بگ بینگ کا ذکر کرتے وقت یہ بتاتا ہے کہ اس سے ایک ترتیب و نظم پیدا ہوا جو ایک متنازعہ بات ہے تو وہ یقیناً بگ بینگ کی ایک مادہ پرستانہ تعصب کے ساتھ تشریح کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک "بے قابو دھماکہ" تھا۔ تاہم وہ دراصل اپنی ہی بات کی تردید کر رہا تھا جب وہ یہ بیان کر رہا تھا کیونکہ وہ ایسا محض اس لئے تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ وہ خالق کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اگر ایک دھماکے سے عظیم ترتیب و نظام پیدا ہوا تو پھر تو "بے قابو دھماکہ" کا تصور ایک طرف رکھ دیا جانا چاہئے تھا اور یہ بات تسلیم کر لی جانی چاہئے تھی کہ دھماکہ غیر معمولی طور پر قابو میں تھا۔

بگ بینگ کے بعد ایک اور غیر معمولی نظم جو اس کائنات میں تشکیل ہوا اس کا ایک پہلو "قابل رہائش کائنات" کی تخلیق تھی۔ ایک قابل رہائش سیارے کی تشکیل کے لئے جو حالات درکار ہوتے ہیں وہ اس قدر ہیں کہ یہ سوچنا بھی ناممکن ہے کہ یہ تشکیل محض اتفاقی یا انطباقی ہے۔

پال ڈیویز ایک مشہور پروفیسر، نظری طبیعات تھا۔ موصوف نے جائزہ لیا کہ بگ بینگ کے بعد پھیلاؤ کی رفتار کس قدر "نفاست کے ساتھ موزوں" بنائی گئی تھی اور وہ ایک ناقابل یقین نتیجے پر پہنچا تھا۔ ڈیویز کے خیال میں بگ بینگ کے بعد کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار کی شرح بلین/ا مرتبہ تھی جس میں کوئی بھی قابل رہائش ستارہ قسم کی شے متشکل نہیں ہو سکتی تھی۔

نہایت محتاط طریقے سے پیمائش کی جائے تو پھیلاؤ کی شرح ایک نہایت نازک قدر پیمائی کے قریب پہنچتی ہے جس پر یہ کائنات اپنی کشش ثقل سے باہر نکل جائے گی اور ہمیشہ کے لئے پھیل جائے گی۔ اگر قدرے سست رفتار ہو گی تو کائنات تباہ ہو جائے گی، اگر ذرا سی تیز ہوئی تو کائنات کا سارا تار و پود مکمل طور پر منتشر ہو جائے گا۔ مختصراً یہ پوچھنا بڑا دلچسپ لگتا ہے کہ کائنات کے پھیلاؤ کی شرح کو کس قدر نزاکت و نفاست کے ساتھ "عمدہ طریقے" سے رکھا گیا ہے تا کہ وہ ان دو

تباہیوں کے درمیان اس تنگ سے خطِ تقسیم پر گر سکے۔ اگر ا۔ ایس (S-1) وقت پر (جس وقت سے پھیلاؤ کا نمونہ پہلے ہی مقرر کیا جا چکا تھا) شرح پھیلاؤ اپنی اصل قدر و قیمت سے ۱۸-۱۰ سے بھی زیادہ کی شرح سے مختلف تھی۔ تو یہ نازک توازن کو خراب کرنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ کائنات کی دھماکہ خیز قوت کو اس کی کم و بیش ناقابل یقین قوتِ کشش ثقل پیدا کرنے کی صلاحیت کے ساتھ صحیح صحیح حالت میں ہم پلہ رکھا گیا۔ بگ بینگ بظاہر کوئی قدیم بینگ نہیں تھی بلکہ یہ ایک نہایت نفاست کے ساتھ ترتیب دیا ہوا دھماکہ تھا جس نے کائنات کو پھیلا ؤ دیا۔

وہ قوانین طبیعات جو بگ بینگ کے ساتھ ہی وجود میں آ گئے تھے ۱۵ بلین برس گزر جانے کے باوجود تبدیل نہ ہوئے۔ مزید یہ کہ یہ قوانین اس قدر نپے تلے حساب کتاب کے ساتھ وجود میں آئے تھے کہ ان کی جاریہ قیمتوں (Values) سے ایک ملی میٹر کا فرق بھی پوری کائنات کے مکمل ڈھانچے اور ساخت کی تباہی و بربادی کا باعث بن سکتا تھا۔

مشہور ماہر طبیعات پروفیسر سٹیفن ہاکنز اپنی کتاب ''مختصر تاریخ زماں'' (A Brief History of Time) میں لکھتا ہے کہ یہ کائنات ان حساب کتاب کے مطابق طے شدہ جائزوں اور توازنوں پر قائم کی گئی ہے اور اسے اس قدر نفاست کے ساتھ ''نوک پلک درست'' کر کے رکھا گیا ہے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ کائنات کے پھیلاؤ کی شرح کے حوالے سے کہتا ہے:

''کائنات پھیلاؤ کی اس نازک شرح کے ساتھ کیوں شروع ہوئی جو ایسے نمونوں (Models) کو جدا کرتی ہے جو ان سے منہدم ہو جائیں اور جو ہمیشہ کے لئے پھیلتے رہتے ہیں، تاکہ آج بھی، دس ملین برس گزرنے پر یہ تقریباً ایک نازک شرح کے ساتھ پھیل رہی ہو؟ اگر بگ بینگ کے ایک سیکنڈ بعد پھیلاؤ کی شرح سو ہزار ملین ملین کے ایک حصے سے بھی کم ہوتی تو یہ کائنات اپنے موجودہ حجم کو پہنچنے سے قبل تباہ ہو گئی ہوتی۔

پال ڈیویز بھی اُس ناگزیر نتیجے کے بارے میں بتاتا ہے، جو ان ناقابل یقین حد تک نازک و لطیف توازنوں اور حساب کتاب سے کئے گئے جائزوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے:

اس تاثر کی راہ میں رکاوٹ بننا مشکل نظر آتا ہے کہ کائنات کی موجودہ ساخت اس قدر حساس ہے کہ بظاہر تعداد میں معمولی سے ردوبدل کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی، اسے بڑی احتیاط کے ساتھ سوچا گیا ہے...... عددی قیمتوں کی معجزانہ مطابقت جو ہمیں نظر آتی ہے قدرت نے اسے ایسی

غیر متغیر صلاحیت دی ہے کہ وہ کائنات کی ساخت اور ڈیزائن کے ایک ایک عنصر کے لئے نہایت ٹھوس ثبوت بن جائے۔

اسی حقیقت کے تسلسل میں ایک ماہر فلکیات پروفیسر جارج گرین سٹائن اپنی کتاب "The Symbiotic Universe" میں لکھتا ہے:

''جب ہم پورے ثبوت کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ خیال بڑی شدومد کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ کوئی مافوق الفطرت طاقت یا واحد قوت اس میں ضرور شریک ہے''۔

مادے کی تخلیق

ایٹم، جو مادے کے وجود میں اہم تعمیری سہارا بنتا ہے، بگ بینگ کے بعد وجود میں آیا۔ پھر ان ایٹموں نے یکجا ہو کر اس کائنات کو بنایا جس میں ستارے، زمین اور سورج شامل تھے۔ بعد ازاں انہی ایٹموں نے کرۂ ارض پر زندگی کی ابتداء کی۔ آپ کو گردوپیش میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے: آپ کا اپنا جسم، کرسی جس پر آپ بیٹھتے ہیں، کتاب جسے آپ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہیں، وہ نیلگوں آسماں جس پر کھڑکی سے آپ کی نظر پڑتی ہے، زمین، ذرات کے تودے، پھل، پودے، تمام جاندار اشیاء اور وہ تمام مادی اشیاء جن کے بارے میں آپ تصوّر کر سکتے ہیں یہ ایٹموں کے جمع ہونے سے وجود میں آئی ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ پھر یہ ایٹم کیا ہے، جو ہر شے کا تعمیری جزو ہے، یہ کس شے کا بنا ہوا ہے اور اس کی ساخت کیا ہے؟

جب ہم ایٹموں کی ساخت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کا ایک نمایاں ڈیزائن ہے اور یہ ایک خاص ترتیب و نظم کے ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ ہر ایٹم کا ایک مرکزہ ہوتا ہے جس میں مختلف تعداد میں پروٹون اور نیوٹرون ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ایسے الیکٹرون ہوتے ہیں جو مرکزے کے گرد ایک مخصوص محور میں ۱۰۰۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔

ایک ایٹم کے اندر الیکٹرون اور پروٹون مساوی تعداد میں ہوتے ہیں اس لئے کہ مثبت اور منفی برقی قوت رکھنے والے الیکٹرون ایک دوسرے کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ ان اعداد میں سے ایک بھی مختلف ہوتا تو ایٹم کا وجود ہی نہ ہوتا اس لئے کہ اس سے برقی مقناطیسی توازن بگڑ جانا تھا۔

ایٹم کی ساخت میں پایا جانے والا نظم پوری کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ ایٹم اور ایک خاص ترتیب سے حرکت کرنے والے اس کے ذرات کے ساتھ، پہاڑ منتشر نہیں ہیں، خشکی کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو گئے، آسمان پھٹ نہیں گیا اور مختصر یہ کہ مادے کو اکٹھا رکھا گیا ہے جو غیر متغیر ہے۔

ایک ایٹم کا مرکزہ، پروٹون اور اس کے اندر کے نیوٹرون اور اس کے گرد الیکٹرون ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔ یہ مخصوص رفتار کے ساتھ اپنے گرد اور ایک دوسرے کے گرد غلطی کیے بغیر گھومتے ہیں۔ یہ رفتار ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ متناسب ہوتی ہے اور ایٹم کی بقا کا باعث بنتی ہے۔ کوئی بدنظمی، عدم مطابقت یا تبدیلی و تغیر واقع نہیں ہوتا۔

یہ بات بے حد اہم ہے کہ اس قدر منظم اور اٹل اشیاء ایک ایسے عظیم دھماکے کے بعد وجود میں آئیں جو عدم وجود میں پیش آیا تھا۔ اگر یہ بگ بینگ بے قابو طریقے سے کیا گیا انطباقی دھماکہ ہوتا تو اس صورت میں اس کے بعد الل ٹپ پیش آنے والے فوری واقعات کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہئے تھا اور ہر وہ شے جو اس کے بعد متشکل ہوتی ایک بدنظمی و انتشار کی نذر ہو جانی چاہئے تھی۔

دراصل اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد ہر مقام پر ایک بے نقص نظم اور ترتیب محیط ہے۔ مثلاً بیشک ایٹم مختلف جگہوں اور مختلف وقتوں میں متشکل ہوتے ہیں لیکن وہ اس قدر منظم ہوتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایک ہی کارخانے سے پوری صناعی کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ سب سے پہلے الیکٹرونوں کو ایک مرکزہ ملتا ہے جس کے گرد وہ گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ایٹم اکٹھے ہو جاتے ہیں تاکہ مادہ تشکیل دے سکیں اور یہ سب مل کر بامعنی، بامقصد اور معقول اشیاء تیار کرتے ہیں۔

مبہم، بیکار، غیر معیاری اور بے مقصد چیزیں کبھی پیدا نہیں ہوتیں۔ چھوٹی سے چھوٹی اکائی سے لے کر سب سے بڑے عنصر ترکیبی تک ہر شے ایک منظم طریقے سے بیشمار مقاصد کے لئے بنائی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ خالق کی ہستی کا ٹھوس ثبوت پیش کرتا ہے، وہ خالق جو قادر مطلق ہے۔ اس حقیقت سے یہ بات بھی منکشف ہوتی ہے کہ وہ خالق جسے چاہتا ہے جب چاہتا ہے وجود میں لے آتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی تخلیق کے بارے میں یوں ارشاد باری تعالی ہوا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ

''وہی ہے جس نے آسمان وزمین کو برحق پیدا کیا ہے اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا، اس کا ارشاد عین حق ہے''۔ (سورۃ الانعام:۷۳)

بگ بینگ کے بعد

راجر پنروز (Roger Penrose) نے جو ایک ماہر طبیعات ہے، کائنات کی ابتداء کے بارے میں وسیع تحقیق کی ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ کائنات جہاں ہے یہ یہاں محض اتفاق سے نہیں آ گئی بلکہ اس کا یقیناً کوئی مقصد ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں '' کائنات بس ہے وہاں، جہاں یہ ہے'' اور یہ وہیں رہے گی۔ ہم اپنے آپ کو اس ساری چیز میں درمیان میں پاتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر غالباً اس کائنات کو سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کرے گا۔ پنروز کے خیال میں وہ کائنات کو سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کرے گا۔ پنروز کے خیال میں وہ کائنات جسے آج ہم سمجھ نہیں پا رہے اس میں بہت سے گہرے معاملات چلے آ رہے ہیں۔

بیشک اس ماہر طبیعات کے خیالات ہماری فکر کو مہمیز لگانے میں مدد دیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے خیالات غلط ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات اپنی تمام تر کامل ہم آہنگی کے باوجود بے مقصد موجود ہے اور اس دنیا میں ان کی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ نہیں۔

تاہم بگ بینگ کے بعد جو نہایت کامل اور حیرت انگیز ترتیب ونظم وجود میں آئے ان کی موجودگی میں اسے عام سی یا معمولی کائنات نہیں سمجھا جا سکتا۔

ایٹم کی ساخت میں پایا جانے والا نظم پوری کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ ایٹم اور ایک خاص

ترتیب سے حرکت کرنے والے اس کے ذرّات کے ساتھ، پہاڑ منتشر نہیں ہیں، خشکی کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوگئے، آسمان پھٹ نہیں گیا اور مختصر یہ کہ مادے کو اکٹھا رکھا گیا ہے جو غیر متغیر ہے۔

المختصر یہ کہ جب ہم اس کائنات کے شاندار نظام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کائنات کا وجود اور اس کے اندر رائج نظام نہایت نازک توازنوں اور ایک ایسے نظم وترتیب پر قائم ہے جو اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی طرح بھی اتفاق یا انطباقی اسباب وعلل سے اس کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ بگ بینگ جیسے دھماکے کے بعد اس قسم کے نظم کی تشکیل صرف مافوق الفطرت تخلیق کے نتیجے ہی میں ممکن تھی۔

اس کائنات کا بے مثال منصوبہ اور ترتیب ونظم یقیناً ایک ایسے خالق کی موجودگی کو ثابت کرتا ہے جو لامحدود علم، طاقت اور دانائی رکھتا ہو اور جس نے مادے کو عدم سے وجود بخشا ہو اور جو اسے کنٹرول کرتا اور مسلسل اس کا نظام چلاتا ہے۔ یہ خالق اللہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان واقع ہے سب کا مالک ہے۔

یہ تمام حقائق یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ مادہ پرستانہ فلسفے کے دعوے، جو فلسفہ کہ ۱۹ویں صدی کا عقیدہ ہے، بیسویں صدی میں سائنس کے ذریعے باطل قرار دیئے جاتے ہیں۔

کائنات میں جو عظیم منصوبہ، ڈیزائن اور نظم وترتیب جاری وساری ہے اسے منظر عام پر لانے کے بعد جدید سائنس نے اس خالق کے وجود کو ثابت کردیا ہے جس نے یہ کائنات تخلیق کی ہے، جو اس کا حکمران ہے یعنی اللہ۔

صدیوں تک لاتعداد انسانوں پر حکمرانی کرنے اور اپنے آپ کو "سائنس" کے پردے میں پیش کرتے ہوئے، مادہ پرستی نے ہر شے کے صرف اور صرف مادے سے وجود میں آنے کی بات کی۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے اللہ کے وجود سے انکار کیا، جس نے مادے کو تخلیق کیا، اسے ایک نظم وترتیب عطا کی اور اسے عدم سے وجود بخشا۔ ایک دن ایسا آئے گا جب مادہ پرستی کو تاریخ میں ایک ایسے قدیم اور توہم پرستانہ عقیدے کے طور پر یاد کیا جائے گا، جو استدلال اور سائنس دونوں کی مخالفت کرتا ہوگا۔

آسمانوں وزمین میں نشانیاں

فرض کیجئے کہ آپ کئی ملین کھلونوں کے تعمیری بلاکوں پر مشتمل اجزائے ترکیبی کو جوڑ کر ایک بہت بڑا شہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس شہر میں فلک بوس عمارتیں اور پلازے ہوں، پر پیچ سڑکیں، جھیلیں، جنگلات اور ایک ساحل سمندر ہو، اس شہر میں بیشمار لوگ بھی رہتے ہوں جو اس کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے ہوں، گھروں میں زندگی کے ہنگامے ہوں، دفتروں میں کام کرنے والوں کی رونق ہو، یہ ساری تفصیل یکجا کر لیں۔ پھر ٹریفک کی روشنیوں، تھیٹر و سینما کے ٹکٹ، دفتروں اور بس سٹیشنوں پر لگے ہوئے سائنس بورڈوں کو بھی اس ساری تفصیل کا حصہ بنالیں۔

اب اگر کوئی آ کر آپ سے یہ کہے کہ اس شہر کے تمام کھلونوں کے گھروندے، جو آپ نے چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو بھی سامنے رکھ کر ایک باقاعدہ منصوبہ بندی سے تعمیر کیے، جن کے ایک ایک ٹکڑے کو آپ نے بڑی محنت اور کوشش سے چن چن کر اپنی جگہ پر نصب کیا، یہ تو سب کچھ محض اتفاق سے وجود میں آ گیا اور اس طرح یہ شہر یہاں کھڑا ہو گیا تو آپ اس شخص کی ذہنی حالت کے بارے میں کیا کہیں گے؟

اب آپ واپس اس شہر میں جائیں جسے آپ نے بڑی محنت سے تعمیر کیا۔ یہ تصور کریں کہ اگر آپ اس کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک ٹکڑا بھی کہیں رکھنا بھول گئے تھے یا اسے اپنی جگہ سے ہٹ کر کہیں لگا دیا تھا تو کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ آپ کو اس شہر کو زمین بوس ہونے سے بچانے کے لئے کس قدر زیادہ توازن اور نظم برقرار رکھنے کی ضرورت ہو گی؟

اس دنیا کی زندگی بھی، جس میں ہم آباد ہیں ایسی ہی لاتعداد ان جزئیات سے مل کر بنی ہے جن کا احاطہ کرنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ان جزئیات میں سے ایک کی کمی کا مطلب بھی

اس زمین پر زندگی کے ختم ہو جانے کی دلالت کرے گا۔

ہر شے، (ایٹم کی) ہر جزئیات، مادے کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی سے لے کر ان کہکشاؤں تک جو کئی کئی بلین ستاروں کو جگہ دیئے ہوئے ہوتی ہیں، چاند سے لے کر جو دنیا کا ایک نہ علیحدہ ہو سکنے والا حصہ ہے، نظام شمسی تک، تمام ایک مکمل ہم آہنگی میں کام کرتے ہیں۔ یہ نہایت منظم نظام ایک گھڑی کی مانند ہر نقص سے پاک رہتے ہوئے چلتا رہتا ہے۔ لوگوں کو اس کئی بلین برس پرانے نظام پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے کہ یہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ ایک معمولی سی جزئیات بھی ادھر سے ادھر نہ ہوگی، جس کی عدم موجودگی میں انسانی ذہن اس کے حصول کے لئے دس برس بھی سوچتا رہے تو کامیاب نہ ہو سکے گا۔ کسی کو بھی یہ فکر لاحق نہیں کہ کل سورج نکلے گا بھی یا نہیں۔ لوگوں کی اکثریت یہ نہیں سوچتی کہ "کیا کبھی یہ دنیا سورج کی کشش ثقل سے ٹوٹ کر آزاد ہو جائے گی اور خلاء کے انجانے گھپ اندھیروں کی جانب حرکت کرنے لگے گی"۔ اور "اسے ایسا ہو جانے سے کس نے روک رکھا ہے؟"۔

اسی طرح جب لوگ سونے لگتے ہیں تو نیند سے چند لمحے قبل انہیں یہ یقین محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل کی حرکت یا نظام تنفس ان کے دماغوں کی مانند سست نہیں پڑ جائے گا۔ تاہم ان دو نہایت اہم نظاموں میں سے کسی ایک کا بھی چند سیکنڈوں کے لئے رک جانا ایسے نتائج برآمد کرتا ہے جن میں کسی کو زندگی تک سے ہاتھ دھونے پڑ جاتے ہیں۔

جب "اپنائیت وشناسائی" کی وہ عینک جو پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور جس سے ہر ایک واقعہ کا جائزہ اس طرح لیا جاتا ہے جیسے "یہ اپنے قدرتی راستے پر چل کر پیش آرہا ہے"، ہٹا لی جائے تو ہر شخص آزادی سے یہ دیکھ سکتا ہے کہ ہر شے کی صناعی میں نہایت سختی کے ساتھ آزاد اور باریک بینی پر مشتمل نظاموں کا ہاتھ ہے جن کے بغیر وہ نہایت دشواری کے ساتھ لٹک رہا ہوتا۔ آپ جس جانب نگاہ اٹھا کر دیکھیں ایک نہایت اعلیٰ وعمدہ نظم ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ یقیناً کوئی عظیم طاقت تو ایسی ہے جس نے یہ نظم اور ہم آہنگی تخلیق کی ہے۔ اس عظیم طاقت کا مالک اور سرچشمہ اللہ ہے جس نے ہر شے کو عدم سے پیدا کیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝

''جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے، تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی''۔ (سورۃ الملک: ۴-۳)

جب ہم آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان جاندار چیزوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ سب اپنے خالق کی موجودگی کو ثابت کرتی ہیں۔ اس باب میں ہم مظاہر قدرت اور جانداروں پر بات کرنے والے ہیں جن کو دیکھتا تو ہر کوئی ہے مگر ان پر غور نہیں کرتا کہ یہ کیسے وجود میں آئے اور اپنے وجود کو کیوں کر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں اس کائنات میں پائی جانے والی اللہ کی تمام نشانیوں کو تحریر میں لانا ہوتا تو ہم انسائیکلوپیڈیاؤں کی ہزاروں جلدوں میں بھی انہیں یکجا نہ کر پاتے۔ اس لئے ہم اس باب میں مختصراً کچھ موضوعات پر بات کریں گے جن میں طویل غور وفکر کیا جانا چاہیے۔

تاہم اختصار کے ساتھ کیا گیا یہ ذکر بھی باشعور اور صاحبان علم وفراست کی مدد کرے گا کہ وہ اپنی زندگیوں کی سب سے اہم حقیقت پر نگاہ ڈالیں یا کم از کم وہ اسے ایک بار پھر یاد کرنے میں ان کی مدد کرے۔

اس لئے کہ اللہ موجود ہے۔

آسمانوں اور زمین کی ابتداء اسی نے کی اور اس ذاتِ کو ہم استدلال کے ذریعے جانتے ہیں۔

ہمارے جسم کے اندر کی حیرت انگیز باتیں:

''ایک نصف بالیدہ آنکھ دیکھ نہیں سکتی''

لفظ ''آنکھ'' سننے کے بعد آپ کے ذہن میں سب سے پہلے کیا خیال آتا ہے؟ کیا آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ آپ کی زندگی کی سب سے اہم چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ میں دیکھنے کی صلاحیت ہو؟ اگر آپ اس سے باخبر بھی ہیں تو کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ آپ کی آنکھ میں دوسرے نشان کیا ہیں؟

آنکھ اس بات کا ایک نہایت روشن ثبوت ہے کہ تمام جاندار چیزوں کو تخلیق کیا گیا ہے۔ بصارت سے متعلق تمام اعضاء جن میں جانوروں اور انسانوں کی آنکھیں شامل ہیں ایک نہایت
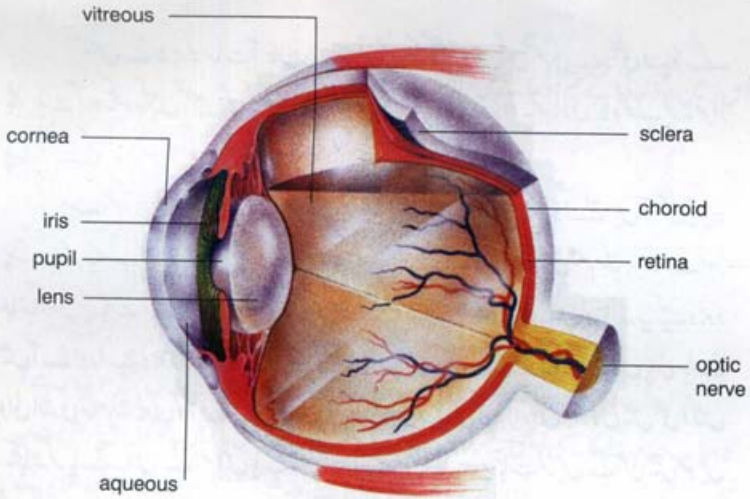
آنکھ، جو انتہائی پیچیدہ ساخت کی حامل ہے دیکھنے کے عمل کے دوران اپنے اجزاء میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں بھی دیکھنے سے قاصر ہے۔ مثال کے طور پر آنسوؤں کی تھیلی بھی دیکھنے کے عمل میں انتہائی اہم ہے۔

کامل و جامع ڈیزائن کی نہایت حیرت انگیز مثالیں ہیں۔ یہ غیر معمولی عضو اس قدر غالب و حاوی ہے کہ دنیا کے نہایت نفیس بصری آلات کے ساتھ بھی اس کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک آنکھ کے لئے دیکھنے کی خاطر اس کے تمام حصوں کا اکٹھا موجود ہونا اور ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک آنکھ کے اندر اس کے تمام حصے، جیسے قرنیہ، آنکھ کی جھلی، قزحیہ (IRIS) پتلی، عدسۂ چشم (Eye lenses) پردۂ چشم، مشیمیہ (Choroid) عضلاتِ چشم، اور عضویاتِ اشک موجود ہوں اور سب کے سب کام کر رہے ہوں ماسوا پپوٹوں کے تو آنکھ بری طرح زخمی ہو جائے گی اور جلد ہی بصارت سے محروم ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر اس کے تمام خلوی عضو موجود ہوں اور صرف آنسو پیدا ہونا بند ہو جائیں تو آنکھ بہت جلد خشک ہو کر بے نور ہو جائے گی۔

اِرتقاء پسندوں کی وضع کردہ "اتفاقات اور انطباق کی زنجیر" آنکھ کی پیچیدہ ساخت کے سامنے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ آنکھ کی موجودگی کی تشریح کسی بھی اور استدلال سے نہیں کی جا سکتی سوائے خاص تخلیق کے۔ آنکھ ایک کثیر حصصی پیچیدہ نظام رکھتی ہے اور جیسا کہ درج بالا سطور میں اس پر بحث کی گئی یہ تمام علیحدہ علیحدہ حصے بیک وقت وجود میں آئے۔ ایک آنکھ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ نصف بالیدگی میں "نصف بصری قوت" کے ساتھ کام کر سکے۔ ایسی حالت میں دیکھنے کا

عمل بیکار ہو جاتا ہے۔ ایک اِرتقاء پسند سائنسدان نے اس سچائی کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"آنکھوں اور پروں میں مشترک صفت یہ ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں کام کر سکتے ہیں اگر وہ مکمل طور پر بالیدہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ایک نصف بالیدہ آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اور ایک ایسا پرندہ جس کے نصف پر نکلے ہوں اڑ نہیں سکے گا"۔

اس معاملے میں ہمیں ایک بار پھر اسی اہم سوال سے واسطہ پڑے گا کہ آنکھ کے تمام حصوں کو اچانک کس نے تخلیق کیا؟

آنکھوں کا مالک یقیناً یہ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ ان کی یہ شکل کس نے بنائی۔ اس لئے کہ وہ انسان جو اس علم سے واقف نہیں ہے کہ دیکھنا کیسا ہے وہ یہ خواہش نہ کر سکے گا کہ اسے دیکھنے کا عضو حاصل ہو جائے اور وہ اسے لے کر اپنے جسم کے اندر جوڑ لے۔ چنانچہ ہمیں اس عظیم دانائی کے مالک کو تسلیم کرنا پڑے گا جس نے جانداروں کو دیکھنے، سننے وغیرہ کی حس کے ساتھ تخلیق کیا۔

دوسرا نقطہ نظر اپنے ساتھ یہ دعویٰ لاتا ہے کہ بے حس خلیوں نے شعور حاصل کر لیا تھا اور اپنی خواہش اور کوشش سے اب دیکھنے اور سننے کا کام لے سکتے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے جانداروں کو حس بصارت عطا کی ہے:

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝

"ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو"۔ (سورۃ الملک: ۲۳)

انسان کے اندر کا لشکر

ہر روز آپ کے جسم کی گہرائیوں کے اندر ایک جنگ لڑی جاتی ہے جس کا ادراک آپ کو نہیں ہوتا۔ اس جنگ میں ایک فریق وائرس اور بیکٹیریا پر مشتمل ہوتا ہے جو آپ کے جسم کے اندر سرایت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے قابو میں کر لیتے ہیں اور دوسری جانب دوسرا فریق محافظ خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ان دشمنوں سے جسم کو بچاتے ہیں۔

دشمن حملے کے لئے انتظار کرتا ہے تاکہ موقع ملتے ہی مطلوبہ حصے میں پہنچ جائے اور پھر پہلے

اے بی خلیہ جب توڑا گیا

امینیتی خلیے جو ایک نہایت نظم و ضبط والی حاکمانہ زنجیر بناتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی احکامات کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

اے بی خلیہ جسے بیکٹیریا نے ڈھانپ رکھا ہے

مرحلے میں اپنے ہدف کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ مگر ہدف والے حصے میں موجود مضبوط، منظم اور اچھے ڈسپلن کے حامل سپاہی دشمن کو آسانی کے ساتھ اندر نہیں آنے دیتے۔ سب سے پہلے تو دفاعی جنگ لڑنے والے یہ سپاہی دشمن کے سپاہیوں کو نگل جاتے ہیں اور انہیں (خلیہ خوروں کو) میدان جنگ میں پہنچتے ہی بے اثر بنا دیتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھار یہ جنگ اس قدر سخت ہوتی ہے کہ دفاع کرنے والے ان سپاہیوں کے بس کی بات نہیں رہتی۔ ایسے موقعوں پر دوسرے سپاہی (بڑے اکال خلیے Macrophages) طلب کر لئے جاتے ہیں۔ ان کی شمولیت ہدف کے علاقے میں خطرہ پیدا کر دیتی ہے اور دوسرے سپاہی (مددگار ٹی خلیے) بھی جنگ میں بلا لئے جاتے ہیں۔

مناعتی خلیے (زرد) سرطان خلیوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں

یہ سپاہی مقامی آبادی سے بہت مانوس ہوتے ہیں۔ وہ بہت جلد اپنی اور دشمن کی فوج کے درمیان پہچان کر لیتے ہیں۔ وہ فوراً ان سپاہیوں کو ہدایات جاری کرتے ہیں جن کے ذمے ہتھیاروں (بی خلیوں) کی فراہمی ہوتی ہے۔ ان سپاہیوں میں غیر معمولی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے دشمن کو کبھی دیکھا نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود وہ ایسے ہتھیار فراہم کر سکتے ہیں جو دشمن کو بے اثر بنا دیں۔ مزید یہ کہ وہ ان ہتھیاروں کو جو انہیں مہیا کرنے ہوتے ہیں جہاں تک ضرورت ہو اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ اس سفر کے دوران وہ اس مشکل ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنے آپ کو کوئی ضرر پہنچائیں نہ ہی اپنے حلیفوں کو۔ بعد ازں حملہ آور ٹیمیں (مارنے والے ٹی خلیے) اندر گھس آتی ہیں۔ یہ دشمن کے نہایت اہم مقام پر وہ زہریلا مادہ چھوڑ دیتی ہیں جو وہ اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ فتح و نصرت کی صورت میں سپاہیوں کا ایک اور دستہ (جبر و تشدد کرنے والے ٹی خلیے) میدان جنگ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور تمام سپاہیوں کو ان کے کیمپ میں واپس بھیج دیتا ہے۔ وہ سپاہی جو میدان جنگ میں آخر میں پہنچتے ہیں (قوت حافظہ کے خلیے) دشمن سے متعلق تمام ضروری معلومات ریکارڈ کر لیتے ہیں تاکہ مستقبل میں اسی قسم کے حملے کی صورت میں اسے استعمال کیا جا سکے۔

جس بہترین لشکر کا اوپر ذکر کیا گیا وہ ایک ایسا امیونیتی نظام ہے جو انسانی جسم کے اندر موجود ہوتا ہے۔ ہر وہ کام جس کا اوپر ذکر ہوا اسے ان خوردبینی خلیوں کے ذریعے کیا جاتا ہے جن کو انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ (مزید معلومات درکار ہوں تو از راہ کرم ملاحظہ کیجئے ایک دوسری تصنیف "غور و فکر کرنے والوں کے لئے: آسمانوں اور زمین میں نشانیاں" - از ہارون یحییٰ)

کتنے لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ان کے جسموں کے اندر اس قدر منظم، ڈسپلن کی پابند اور بہترین فوج موجود ہے؟ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جن کو یہ علم ہے کہ وہ ہر طرف سے جراثیموں سے گھرے ہوئے ہیں جن سے ان کو بیماریاں بھی لگ سکتی ہیں اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے؟ بیشک اس ہوا میں بہت سے خطرناک جراثیمے موجود ہوتے ہیں جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ جو پانی ہم پیتے ہیں وہ ان جراثیموں سے پاک نہیں ہوتا، جو خوراک ہم کھاتے ہیں اس میں جراثیمے ہوتے ہیں یہاں تک کہ جن سطحوں کو ہم چھوتے ہیں وہ جراثیموں سے خالی نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں جبکہ ایک انسان اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے اس کے جسم کے اندر موجود خلیے مسلسل اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اسے اس بیماری سے بچالیں جو اس کی موت کا بھی باعث ہو سکتی ہے۔

ان تمام امیونیتی خلیوں میں صلاحیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جسم کے خلیوں اور دشمن خلیوں کے درمیان فرق کی پہچان رکھتے ہیں۔ بی خلیوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس دشمن کو بیکار بنا دینے کے لئے ایک ہتھیار تیار کرتے ہیں جسے انہوں نے کبھی دیکھا نہیں ہوتا۔ جسم کے خلیوں کو چھوئے بغیر وہ ان ہتھیاروں کو جسم کے اندر مطلوبہ مقام تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور پیغام موصول کرنے والے خلیے بلاعذر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کام ختم ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ پر واپس آنے میں کوئی مسئلہ محسوس نہیں کرتے اور قوت حافظہ کے خلیے اس نظام میں ایسی نمایاں صفات کے حامل ہوتے ہیں کہ یہ صلاحیتیں صرف ان ہی کو ودیعت کی گئی ہوتی ہیں۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر کسی اِرتقاء پسند مصنف نے امیونیتی نظام کی تشکیل کی کہانی پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔

جس انسان میں یہ امیونیتی نظام نہ ہو یا پوری طرح کام نہ کر رہا ہو اس کے لئے یہ بے حد مشکل ہے کہ وہ زندہ رہ سکے اس لئے کہ وہ باہر کی دنیا میں تمام جراثیموں اور وائرسوں کی زد میں ہو

گا۔ آج اس طرح کے لوگ کسی خاص احاطہ کے اندر بند ہو کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں جبکہ باہر کی کسی بات سے ان کا براہِ راست کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لئے ایک ایسے انسان کے لئے جو امیننیتی نظام کے بغیر ہو اپنی نسل کے لوگوں کے درمیان قدیم ماحول میں زندہ رہنا ناممکن ہو گا۔ یہ بات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ امیننیتی نظام جیسا پیچیدہ اور جامع نظام فوری طور پر اپنے تمام عناصر ترکیبی سمیت صرف تخلیق ہی کیا جا سکتا تھا، خود بخود وجود میں نہ آ سکتا تھا۔

ایک ایسا نظام جو اپنی جزئیات کے ساتھ وضع کیا گیا

سانس لینا، کھانا، پیدل چلنا وغیرہ لوگوں کے لئے بہت فطری باتیں ہیں مگر بہت سے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ یہ بنیادی نوعیت کے کام کس طرح عمل پذیر ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب آپ پھل کھاتے ہیں تو آپ یہ نہیں سوچتے کہ یہ آپ کے جسم کے لئے کیوں کر مفید ہو گا۔ آپ کے ذہن میں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ آپ اچھا اور صحت بخش کھانا کھائیں۔ عین اس وقت آپ کا جسم بڑی جزئیات کے ساتھ ایسے فعل سے گزر رہا ہو گا جس کا آپ کو کوئی تصور نہ ہو، تا کہ وہ اس کھانے کو آپ کے لئے ''صحت بخش'' بنا سکے۔

جونہی خوراک کا ایک لقمہ آپ کے منہ کے اندر جاتا ہے وہ نظام ہضم جہاں یہ جزئیات عمل پذیر ہوتی ہیں کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتداء ہی سے اس نظام میں شریک ہو جانے پر لعاب دہن خوراک کو پہلے گیلا کرتا ہے اور دانتوں نے اس کے پس جانے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل ہو جانے پر مُری (Oesphagus) سے نیچے اتار دیتا ہے۔

مُری خوراک کو معدے کے اندر پہنچنے میں مدد دیتی ہے جہاں ایک نہایت جامع توازن کام کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر معدے میں موجود نمک کے ترشے سے یہ خوراک ہضم ہو جاتی ہے۔

یہ ترشہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اس میں موجود صلاحیت خوراک کو تحلیل کر دیتی ہے اور یہ خود معدے کی حفاظتی دیواروں کو بھی پگھلا دیتا ہے۔ بیشک اس قسم کا نقص اس طرح کے کامل نظام میں نہیں پایا جانا چاہئے۔ ایک رطوبت جسے لعاب کا نام دیا گیا ہے اور جو ہضم کے دوران رطوبت میں بدلتی رہتی ہے معدے کی تمام دیواروں کو گھیر لیتی ہے اور نمک کے ترشے کے تباہ کن اثرات سے ان کی حفاظت کرتی ہے۔ اس طرح معدہ تباہ ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

نظام ہضم کا باقی کام بھی اسی طرح ایک منصوبے کے تحت انجام پاتا ہے۔ مفید خوراک کے

وہ ٹکڑے جن کو نظام ہضم توڑتا ہے، انہیں چھوٹی آنت کی دیواریں جذب کر لیتی ہیں اور یہ خون کی ندی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی آنت کے اندر کی سطح پر چھوٹے چھوٹے عسلج (Tendrils) جمع ہو جاتے ہیں جنہیں ''خملہ'' (Villus) کہتے ہیں۔ اس خملے کے سب سے اوپر والے حصے میں موجود خلیوں پر خورد بینی توسیع ہوتی ہے جسے ''خورد خملے'' (Microvillus) کہتے ہیں۔ یہ توسیعات خوراک کو جزو بدن بنانے کے لئے پمپوں کا کام کرتی ہیں اس طرح جزو بدن بننے والی خوراک جسم میں نظام دوران خون کے ذریعے چاروں طرف پہنچادی جاتی ہے۔

یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ جس نظام کو مختصراً اوپر بیان کیا گیا ہے اِرتقاء اُس کی تشریح کسی طرح بھی نہیں کر سکتا۔ اِرتقاء اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ آج کے پیچیدہ نامیاتی جسم قدیم جانداروں سے چھوٹی چھوٹی ساختیاتی تبدیلیوں کے بتدریج جمع ہو جانے سے عمل تغیر کے ذریعے وجود میں آئے تاہم جیسا کہ اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ معدے کے اندر کا نظام بتدریج
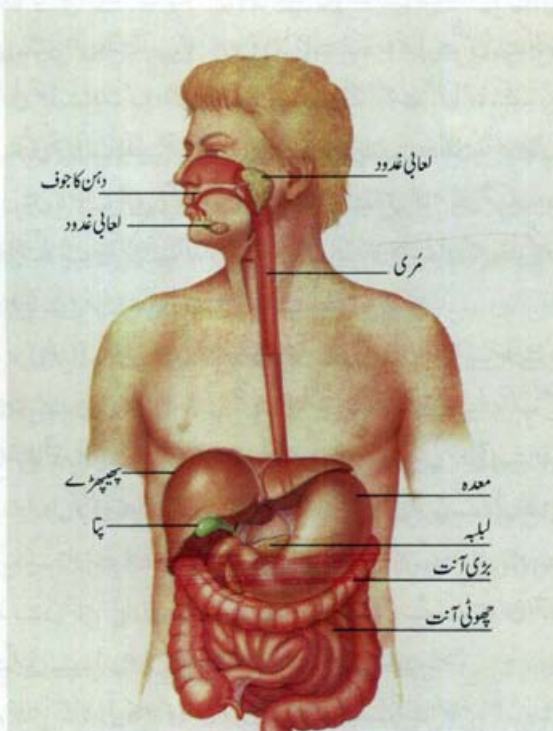
کسی صورت میں بھی متشکل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک عنصر کی کمی بھی نامیاتی جسم کے لئے پیغام اجل بن سکتی تھی۔

جس وقت خوراک معدے کے اندر پہنچتی ہے تو معدئ رطوبت میں خوراک کی کئی کیمیائی تبدیلیوں کے نتیجے میں توڑنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب آپ ایک جاندار کے بارے میں تصور کر سکتے ہیں کہ اس ارتقائی عمل میں اس کے جسم میں اس قسم کی کیمیائی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ یہ جاندار جس میں معدئ رطوبت موجود نہ ہو اس خوراک کو ہضم نہ کر سکے گا جو وہ کھائے گا جس کے نتیجے میں وہ بھوک سے مر جائے گا اور غیر ہضم شدہ خوراک اس کے معدے میں جمع ہو جائے گی۔

مزید یہ کہ اس تحلیل کرنے والے ترشے کی افراز (Secretion) کے دوران معدے کی دیواریں ساتھ ساتھ وہ افراز پیدا کرتی ہیں جسے لعاب کہتے ہیں وگرنہ معدے کے اندر موجود یہ ترشہ تو معدے کو تباہ کر دے گا۔ اس لئے زندگی کو قائم رکھنے کے لئے معدے کو یہ دونوں سیال مادے ساتھ ساتھ پیدا کرنے ہوں گے (ترشہ اور لعاب)۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی تدریجی انطباق یا اتفاقیہ ارتقاء نہیں تھا بلکہ شعوری تخلیق تھی جو اپنے تمام نظاموں سمیت اثر انداز ہوئی۔

اس ساری تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی جسم کی مثال ایک بہت بڑے کارخانے کی سی ہے جس کے اندر بہت سی چھوٹی چھوٹی مشینیں نہایت ہم آہنگی سے کام کر رہی ہیں۔ جس طرح تمام کارخانوں کا کوئی نہ کوئی نمونہ ساز انجینئر اور منصوبہ ساز ہوتا ہے اسی طرح انسانی جسم کا ایک اعلیٰ وارفع خالق ہے۔

جانور اور پودے

دنیا میں پودوں اور جانوروں کی کئی ملین قسمیں ہیں جو ہمارے خالق کے وجود اور طاقت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہ تمام جاندار جن میں سے محدود سی تعداد کے جانداروں کا یہاں مثال کے طور پر ذکر کیا جائے گا یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے۔ ان سب کے اجسام میں کچھ نظام کام کر رہے ہیں، ان کی اپنی اپنی دفاعی چالیں ہیں، خوراک حاصل کرنے کے بے مثال طریقے ہیں اور وہ دلچسپ تولیدی طریقے رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان تمام جانداروں کو ان کے خدوخال سمیت اس ایک کتاب میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ کئی جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیاؤں

میں بھی اس کام کو سمونا سعیٔ لاحاصل ثابت ہو گی۔

تاہم یہاں جو چند ایک مثالیں زیر بحث آئیں گی وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں گی کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کے آغاز کو اتفاقات یا انطباق یا حادثاتی واقعات کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔

لاروا سے تتلی تک

اگر آپ کے پاس ساڑھے چار پانچ سو انڈے ہوں اور آپ کو انہیں باہر محفوظ کرنا پڑ جائے تو آپ کیا کریں گے؟ آپ زیادہ عقلمندی سے کام لیتے ہوئے یہ احتیاط کریں گے کہ قدرتی حالات کے اثرات سے جن میں ہوا بھی شامل ہے ان انڈوں کو اِدھر اُدھر بکھر جانے سے بچانے کی پوری کوشش کریں۔ ریشم کا کیڑا ۵۰۰-۴۵۰ تک انڈے دیتا ہے، ریشم کے کیڑے اپنے انڈوں کی حفاظت ایک نہایت دانشمندانہ طریقے سے کرتے ہیں: وہ تمام انڈوں کو ایک ایسے چپچپے مادے (لزوجی مادے) سے جوڑ لیتے ہیں جو ایک دھاگے کی شکل کا ہوتا ہے۔ یوں وہ انہیں اِدھر اُدھر بکھر جانے سے بچا لیتے ہیں۔

لاروے اپنے انڈوں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے کوئی ایسی شاخ تلاش کرتے ہیں جہاں وہ محفوظ رہ سکیں اور اسی دھاگے کی مدد سے وہ اس شاخ کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لیتے ہیں۔ بعد میں وہ اپنے لئے ایک ریشمی نسیج (Cocoon) تیار کرتے ہیں جس میں وہ اس دھاگے سے مدد لیتے ہیں جسے وہ رطوبت کے ذریعے بناتے ہیں۔ اس سارے عمل سے گزرنے کے لئے ایک لاروے کو جس نے حال ہی میں آنکھیں کھولی ہیں تین سے چار روز تک لگ جاتے ہیں۔ اس عرصے میں ایک لاروا ہزاروں چکر کاٹتا ہے اور ۹ سو سے لے کر پندرہ سو میٹر کی لمبائی تک کا دھاگا بنا لیتا ہے۔ اس عمل کے اختتام پر یہ ایک نیا کام شروع کر دیتا ہے جس کے ذریعے یہ ایک قلب ماہیت سے گزر کر ایک نہایت خوبصورت تتلی بن جاتی ہے۔

نظریۂ ارتقاء نہ تو ایک ماں ریشم کیڑے کے اس عمل کی تشریح کر سکتا ہے جو وہ اپنے انڈوں کی حفاظت کے لئے کرتی ہے نہ ہی اس چھوٹے سے لاروے کے طرزِ عمل کی وضاحت، جس میں وہ لاروا ہر طرح کی تعلیم یا علم و آگہی کے بغیر یہ عمل کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس مادہ ریشم کے کیڑے کی وہ صلاحیت ایک اعجاز ہے جس میں وہ اپنے انڈوں کو اکٹھا رکھنے کے لئے دھاگا تیار

ایک لاروا ریشمی نسیج کے اندر ریشمی دھاگا بناتے ہوئے اور پھر اسے چیر کر علیحدہ کرتے ہوئے اور آخر میں اس کے
اندر سے ایک حیرت انگیز نمونے اور رنگ والی تتلی کی شکل میں باہر نکلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔
تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے؟
تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟
(سورۃ النحل: ۱۷)

کرتی ہے۔ نوزائیدہ لاروا کا یہ جان لینا کہ اس کے لئے نہایت موزوں ماحول کیا ہونا چاہیئے، اس کے مطابق ریشمی نسیج کی بنت کاری، ہیئت قلبی سے اس کا گزرنا جس میں اسے کوئی مسئلہ پیش نہ آئے یہ سب کچھ انسانی ذہن کے ادراک سے بالاتر ہے۔ اس ساری بات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب بھی کوئی لاروا اس دنیا میں آتا ہے تو وہ اس علم و آگاہی کے ساتھ آتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے پیدائش سے قبل یہ سب کچھ "سکھا" دیا گیا تھا۔ آیئے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی نوزائیدہ بچے کو پیدائش کے چند گھنٹوں بعد اٹھ کر کھڑا ہوتا دیکھ لیں اور وہ بچہ اپنا بستر تیار کرنے کے لئے ضروری چیزیں (مثلاً لحاف، تکیہ، گدا وغیرہ) اکٹھی کر رہا ہو اور پھر وہ انہیں نہایت صفائی کے ساتھ جوڑ کر اپنا بستر تیار کر لے اور اس پر لیٹ جائے تو آپ کیا سوچیں گے؟ جب آپ اس واقعہ سے پیدا شدہ حیرت و استعجاب سے نکلیں گے تو آپ غالباً یہ خیال کریں گے کہ اس بچے کو ایسے کام کے لئے رحم مادر کے اندر غیر معمولی طریقے سے تربیت دے دی گئی ہوگی۔ اس لاروے کا معاملہ اس مثال میں مذکور بچے کے معاملے سے مختلف نہیں ہے۔

ایک ریشمی کیڑے کا لاروا اپنے ریشمی نسیج میں، جسے اس نے ریشمی دھاگے سے بنا ہے

ایک بار پھر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں: یہ تمام جاندار جب زندگی میں آتے ہیں تو وہ اسی طرح کرتے اور ایسی ہی زندگی گزارتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے متعین کر دی، جو ان کا خالق ہے۔ قرآن حکیم کی ایک سورۃ میں شہد کی مکھی کا ذکر کیا گیا ہے جسے شہد بنانے کے لئے ربانی رہنمائی عطا کی گئی اور ایسا کرنے کا حکم دیا گیا:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ٥

"اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹیٹوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا"۔ (سورۃ النحل: ۶۸)

اس سے جانداروں کی دنیا کے ایک عظیم راز کی مثال فراہم کی گئی ہے۔ یہ راز یہ ہے کہ تمام

جاندار اللہ کی مرضی کے سامنے جھک گئے ہیں اور وہ اُس مشیت کی پیروی کرتے ہیں جو اس خالق نے ان کے لئے مقرر کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہد کی مکھی شہد اور ریشم کا کیڑا ریشم بنا تا ہے۔

پروں میں تناسب

جب ہم تتلیوں کی تصاویر دیکھتے وقت ان کے پروں پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں ایک نہایت خوبصورت تناسب دکھائی دیتا ہے۔ یہ پر جو گوٹے کناری کے بنے ہوئے لگتے ہیں انہیں دستِ قدرت نے دلکش نمونوں، نقطوں اور رنگوں سے اس طرح مزین کیا ہوا ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک فن کا نادر نمونہ نظر آتا ہے۔

جب آپ تتلیوں کے پروں پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کو دونوں طرف مکمل طور پر ایک جیسے نمونے اور رنگ دکھائی دیتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پیچیدہ اور گنجلک کیوں نہ نظر آتے ہوں۔ چھوٹے سے چھوٹا نقطہ بھی دونوں پروں کے اُوپر موجود ہوگا جس سے ایک بے نقص ترتیب و تناسب کا احساس ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ ان باریک پروں پر موجود کوئی بھی ایک رنگ دوسرے رنگ سے گڈمڈ نہیں ہوتا
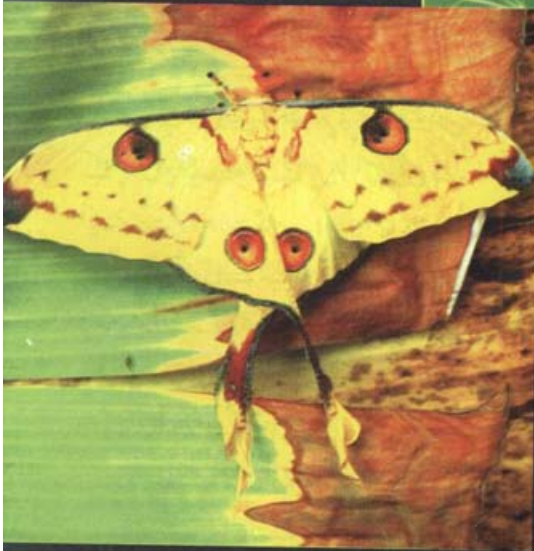
تتلیوں پر موجود خوبصورت اور صاف و واضح نمونے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ جاندار لاشعوری انطباق یا
اتفاق کے نتیجے میں وجود میں نہیں آ گئے بلکہ یہ تو نہایت عمدہ اور بے مثال تخلیق ہے۔

اوران رنگوں کو ایک دوسرے سے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ علیحدہ رکھا گیا ہوتا ہے۔

دراصل یہ تمام رنگ جو ایک دوسرے کے اوپر ایک دوسرے کے قریب قریب نظر آتے ہیں ایک خاص پیمائش کے ساتھ اس شکل میں آتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ تمام رنگ جو آپ کے ہلکے سے لمس سے اتر کر آپ کی انگلیوں پر آجاتے ہیں کس طرح بلا کسی غلطی کے سرزد ہونے کے دونوں پروں پر ایک جیسے نمونے میں سجا دیئے گئے ہیں؟ کسی ایک جگہ سے ذرہ بھر رنگ اتر جائے تو پروں کی اس خوبصورتی کا سارا تناسب بکھر جائے گا۔ اوران کے جمالیاتی پہلو کو بگاڑ دے گا تاہم آپ کو اس زمین پر کوئی ایسی ایک تتلی بھی نظر نہیں آئے گی جس میں کوئی گدلا پن دکھائی دے۔ وہ اس قدر صاف ستھری، دھلی دھلائی اور خوبصورت دکھائی دیتی ہیں جیسے ابھی ابھی کسی مصوّر کے ہاتھوں سے نکلی ہوں۔ اور انہیں یقیناً ایک عظیم خالق نے تخلیق کیا ہے۔

زرّافہ......ایک لمبی گردن والا جانور

زرّافوں میں بڑی حیرت انگیز خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ ان کی گردن لمبی ہونے کے باوجود دوسرے دودھ پلانے جانوروں کی مانند سات ریڑھ کی ہڈی کی طرح کی ہڈیوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ ان کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ ان کو دماغ کی طرف خون کو پمپ کرنے کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا حالانکہ ان کا دماغ لمبی گردن کے سب سے اوپر والے سرے پر ہوتا ہے۔ ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خون کو اس قدر اونچائی پر پہنچانے کے لئے پمپ کرنے میں کس قدر مشکل ہو سکتی تھی۔ مگر زرّافوں کو ایسی کوئی مشکل پیش نہیں آتی اس لئے کہ ان کے دلوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ انہیں جس قدر بھی بلندی پر خون کو پمپ کر کے پہنچانا ہو کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے ان کو زندگی گزارنے میں بلا کسی تگ و دو کے آسانی حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے جانوروں کی مانند زرّافہ کو بھی ایک نہایت جامع اور خوبصورت ڈیزائن کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ط يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

وہ اللہ ہی ہے تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے اس کے لئے بہترین نام ہیں ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔

(سورۃ الحشر: ۲۴)
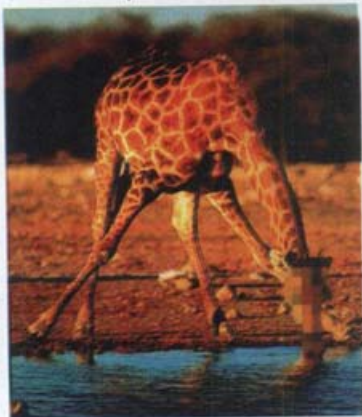
مگر پانی پیتے وقت انہیں ایک مسئلہ ضرور درپیش ہونا چاہئے تھا۔ ہر مرتبہ جب وہ پانی پینے کے لئے جھکتے تو بلند فشار خون کی وجہ سے زرّافوں کو موت کا ڈر رہتا مگر ان کی گردنوں میں ایسا جامع نظام موجود ہے جو اس خطرے کو مکمل طور پر دور رکھتا ہے جب یہ جھکتے ہیں تو ان کی گردن کی رگوں کے صمام (Valves) بند ہو جاتے ہیں جس سے خون کا دماغ کی جانب اضافی بہاؤ رک جاتا ہے۔
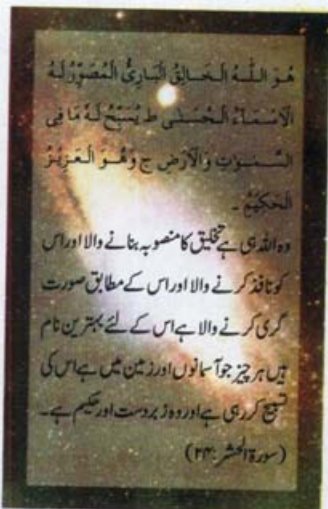
اس میں کوئی شک نہیں کہ زرافہ یہ خاصیتیں اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنی کوشش سے حاصل نہیں کرتا۔ مگر یہ کہنا بھی مناسب نہیں ہوگا کہ یہ تمام اہم خدوخال وقت کے ساتھ ساتھ ایک بتدریج اِرتقائی عمل کے ذریعے وجود میں آئے۔ زرّافے کے لئے زندہ رہنے کی خاطر یہ بڑا اہم معاملہ تھا کہ اسے دماغ کی جانب خون کو پمپ کرنے کا ایک ایسا ہی نظام دیا جاتا اور صمام (Valves) کا ایک ایسا نظام ملتا جو جھکنے کی صورت میں اسے بلند فشار خون سے محفوظ رکھتا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک خاصیت غائب ہوتی یا صحیح طریقے سے کام کرنا چھوڑ دیتی تو زرّافے کے لئے زندگی برقرار رکھنا ناممکن ہو جاتا۔

اس ساری تفصیل سے نتیجہ یہ حاصل کیا جاتا ہے کہ زرّافے کو تخلیق کرنے سے قبل اسے وہ تمام خاصیتیں دے دی گئی تھیں جو زندہ رہنے کے لئے ضروری تھیں۔ جس جاندار کی مثال پہلے موجود نہ تھی اُس جاندار کے لئے اپنے جسم پر مہارت حاصل کرنا اور لازمی صفات شعوری طور پر حاصل کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک زرّافہ بلا تردید یہ ثابت کرتا ہے کہ اسے نیت و ارادے کے ساتھ اللہ نے تخلیق کیا ہے۔

سمندری کچھوے

سمندری کچھوے جو سمندروں میں رہتے ہیں تولیدگی کے وقت ساحل کی جانب ہجوم کی شکل میں رخ کرتے ہیں۔ یہ کوئی عام ساحل سمندر نہیں ہوتا۔ وہ ساحل سمندر جس پر انہیں عمل

اور تمہاری پیدائش میں بھی
اور جانوروں میں بھی جن کو وہ
پھیلاتا ہے، یقین کرنے والوں
کے لئے نشانیاں ہیں۔
(سورۃ الجاثیہ: ۴)
وپر ایک سمندری کچھوے کا بچہ
سورج کے نکلنے سے قبل سمندر کے
ندر پہنچنے والا ہے

تولیدگی سے گزرنا ہوتا ہے تو وہ ہونا چاہئے جس پر وہ پیدا ہوئے تھے۔ بعض اوقات سمندری کچھوؤں کو اس جگہ پہنچنے کے لئے ۸۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا ہوتا ہے۔ مگر طویل اور مشکل آزما سفر صورت حال کو تبدیل نہیں کرتا۔ خواہ کچھ بھی ہو انہیں تو بچے دینے کے لئے وہاں آنا ہوتا ہے جہاں وہ خود پیدا ہوئے تھے۔

کس قدر عجیب وغریب صورت حال ہے کہ ایک جانور کو بیس پچیس برس بعد اس ساحل سمندر پر واپس آنا ہوتا ہے جہاں وہ خود پیدا ہوا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اسے اپنی جائے پیدائش تک پہنچنے کے لئے سمندر کی ان گہرائیوں میں سے گزر کر آنا ہوتا ہے۔ ایسے ساحل جہاں تمام کچھ ایک ہی جیسا نظر آتا ہے یہ وہ مقام ڈھونڈ لیتے ہیں۔

ایک ہی وقت میں ہزاروں کچھوے بغیر کسی قطب نما کے ساحل سمندر پر ایک ہی جگہ ملتے ہیں۔ شروع میں تو لوگوں کی سمجھ میں یہ راز نہ آسکا مگر جب انہیں پتہ چلا تو وہ بے حد حیران ہوئے۔ سمندری کچھوؤں کو چونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بچے سمندر کے اندر زندہ نہ رہ سکیں گے وہ اپنے انڈوں کو ساحل سمندر پر ریت کے نیچے دبا دیتے ہیں۔ مگر یہ سب ایک ہی ساحل پر کیوں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ایک ہی وقت میں؟ کیا مختلف اوقات میں مختلف ساحلوں پر یہ عمل کرنے سے ان کے بچے زندہ نہ بچ سکتے تھے؟ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کو ایک بڑی دلچسپ بات معلوم ہوئی۔ یہ کچھوے اپنے سروں پر موجود کوہان سے جب ان انڈوں کو توڑتے ہیں تو ریت کے نیچے موجود کچھوؤں کے بچوں کو کئی خوفناک مزاحمتوں پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اوسطاً ۳۱ گرام کے کچھوے کے ایک بچے کو اپنے جسم پر موجود ریت کی تہ کو اکیلے ہٹانے میں نہ صرف دشواری پیش آتی ہے بلکہ وہ اس میں ناکام ہو جاتا ہے اور وہ سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جب کچھوؤں کے ہزاروں بچے ساحل سمندر پر زمین کو مل کر کھودنا شروع کرتے ہیں تو چند دنوں میں سطح زمین پر آنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں پھر بھی وہ سطح زمین پر آنے سے قبل رات کا انتظار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دن کے وقت انہیں شکار خوروں کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مزید یہ کہ سخت تیز دھوپ میں تپتی ریت پر رینگ کر چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ رات پڑتے ہی وہ زمین کھودنے کے عمل کو مکمل کر لیتے ہیں اور سطح زمین کے اوپر آجاتے ہیں۔ اندھیرے کے باوجود وہ ساحل سے سمندری پانی تک کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں پھر وہ تیزی سے آگے بڑھتے اور ساحل سمندر کو چھوڑ کر یہاں پھر بیس پچیس برس بعد آنے کے لئے پانی میں اتر جاتے ہیں۔

جب کچھوؤں کے یہ بچے انڈوں سے نکلتے ہیں تو ان کے لئے یہ جاننا ناممکن ہوتا ہے کہ انہیں زمین کھود کر اوپر آنا ہے اور ایک خاص فاصلے پر انتظار کرنا ہے۔ جب ریت کی تہ میں ہوتے ہیں اس وقت یہ ممکن نہیں ہوتا کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ دن کا وقت ہے یا رات ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ شکار خود باہر موجود ہیں اور یہ ان کے قابو آجائیں گے۔ نہ ان کو یہ خبر ہوتی ہے کہ سورج کی وجہ سے ریت تپ کر آگ بنی ہوئی ہے اور اس سے ان کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے اور یہ کہ ان کو سمندر کی طرف تیزی سے جانا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارا شعوری فعل کیسے عمل میں آیا؟

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔

وہ اللہ ہی ہے تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے اس کے لئے بہترین نام ہیں ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ (سورۃ الحشر: ۲۴)

اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ نوزائیدہ سمندری کچھوؤں کے اندر ایک نظام العمل رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس طرح کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے خالق نے ان کی جبلت میں یہ شامل کر دیا ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کی حفاظت کریں۔
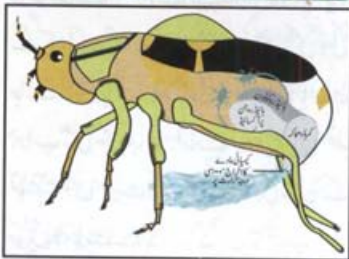
بمبار بھنورا

بمبار بھنورا ایک ایسا کیڑا ہے جس پر کافی تحقیق کی گئی ہے۔ وہ صفت جو اس کیڑے کو زیادہ مقبول بناتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو دشمنوں سے بچانے کے لئے کیمیائی طریقے استعمال کرتا ہے۔

خطرے کی گھڑی میں یہ کیڑا اپنی حفاظت میں دشمن پر اپنے جسم میں ذخیرہ شدہ

ہائیڈروجن پر آکسائڈ اور ہائیڈروکونون کی پچکاری مارتا ہے۔ جنگ کے آغاز سے قبل خصوصی ساخت کے رطوبتی عضو، ان دو کیمیائی مادوں کا نہایت طاقتور آمیزہ تیار کرتے ہیں۔ اس آمیزے کو جسم کے ایک علیحدہ حصے میں ذخیرہ کرلیا جاتا ہے جسے کمرۂ ذخیرہ کہتے ہیں۔ اس کمرے کو ایک دوسرے کمرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے جسے کمرۂ دھماکہ کہتے ہیں ایک پٹھے کی مدد سے (Sphincter muscle) دونوں کمروں کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ جونہی یہ کیڑا خطرہ محسوس کرتا ہے یہ کمرۂ ذخیرہ کے اردگرد کے پٹھوں یا عضلات کو سکیڑ دیتا ہے اور ساتھ ہی Sphincter muscle کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے، اس طرح کمرۂ ذخیرہ کا کیمیائی مادہ کمرۂ دھماکہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اِس طرح کافی مقدار میں حرارت خارج ہوتی ہے اور بخارات بننے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ خارج ہونے والے بخارات اور آکسیجن گیس کمرۂ دھماکہ کی دیواروں پر دباؤ ڈالتی ہیں اور یہ کیمیائی مادہ کیڑے کے جسم سے ایک نالی کے ذریعہ دشمن پر گرتا ہے۔

محققین کے لئے یہ آج تک ایک معمابنا ہوا ہے کہ ایک کیڑے کے جسم کے اندر اس قدر طاقتور نظام کیسے موجود رہتا ہے جو خود بھی اس کیمیائی مادے کی زد میں اس وقت آسکتا ہے جب وہ اسے دشمن کے لئے استعمال کررہا ہو۔ مگر وہ اس نظام میں ان خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظام کی موجودگی اور اس کی کارگزاری ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جسے آسانی کے ساتھ ایک پردار کیڑے سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مسئلہ ابھی تک زیر بحث ہے کہ ایک بمبار بھنورا جس کا سارا جسم دو سینٹی میٹر کے قریب ہو اس طرح کے نظام کو اپنے چھوٹے سے جسم کے اندر کیسے چلا رہا ہے جبکہ انسانوں میں ماہرین اس پر صرف تجربہ گاہوں میں تجربات کر سکتے ہیں۔

ظاہراً ایک ہی سچائی سامنے آتی ہے کہ یہ کیڑا نظریۂ ارتقاء کو مسترد کرنے کے لئے ایک ٹھوس مثال پیش کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس پیچیدہ کیمیائی نظام کے لئے ناممکن ہے کہ یہ انطباقی واقعات کے تسلسل کے نتیجے میں تشکیل پاگیا ہو اور مستقبل کی نسلوں تک منتقل کیا جارہا ہو۔ اس نظام کے کسی ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں بھی کوئی معمولی سا نقص یا کمی رہ جائے تو یہ جانور غیر محفوظ ہو جائے۔ پھر یا تو یہ جلد مار ڈالا جائے گا یا اپنے آپ کو خود بارود کی مانند اڑا دے گا۔ چنانچہ اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ کیمیائی ہتھیار جو اس کیڑے کے جسم کے اندر نصب ہے وہ اپنے تمام حصوں سمیت ایک ہی بار بلا کسی نقص کے وجود میں آیا تھا...... اور ایسا کس نے کیا، اللہ نے، جو خالق کائنات ہے۔

دیمک کے گھروندے

جب کبھی کسی کی نظر زمین پر بنے ہوئے دیمک کے گھروندے پر پڑ جاتی ہے تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ گھروندے ۵ سے ۶ میٹر تک کی بلندی کے ساتھ بنائے جاتے ہیں اور تعمیراتی فن کے حوالے سے حیران کن ڈیزائن میں بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

جب آپ دیمک کے قد وقامت اور اس کے گھروندے کے سائز کا موازنہ کرتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ دیمک نے بڑی کامیابی کے ساتھ گھروندے کی تعمیر کے ایک ایسے پراجیکٹ کو جو اس کے اپنے جسم سے ۳۰۰ گنا بڑا ہے مکمل کیا ہے۔ اور سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ دیمک اندھی ہوتی ہے۔

جس انسان نے اندھی دیمک کے تعمیر کردہ بڑے بڑے گھروندے کبھی نہ دیکھے ہوں وہ تو غالباً یہی سوچے گا کہ یہ ریت کے گھروندے ہیں جن میں ریت کو ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کی شکل میں رکھ دیا گیا ہے۔ تاہم دیمک کا گھروندہ ایک اس قدر شاندار ڈیزائن میں تعمیر ہوتا ہے کہ جس کا انسانی ذہن تصور ہی نہ کر سکے یہاں تک کہ ان کے اندر ایسی سرنگیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو کاٹ کر گزر رہی ہوں۔ غلام گردشیں، روشنی کے لئے روشندانوں کا نظام، خاص قسم کی پھپھوندی پیدا کرنے کے لئے احاطے اور باہر جانے کے محفوظ راستے، سبھی کچھ تو اس دیمک کے چھوٹے سے گھروندے کے اندر ملتا ہے۔

آپ اگر ہزاروں بینائی سے محروم افراد کو اکٹھا کر لیں اور ان کے ہاتھوں میں تمام قسم کے تکنیکی اوزار دے دیں پھر بھی آپ ان سے دیمکوں کی تعمیر کردہ کالونی میں شامل ایک گھروندے جیسا گھروندہ بھی تیار نہ کروا سکیں گے۔ اس لئے ذرا غور تو فرمائیے:

۲-اینٹی میٹر لمبی دیمک نے فن تعمیر وانجینئری سے متعلق وہ سب کچھ کیسے سیکھ لیا ہوگا جس کی اس طرح کے فنی مہارت سے بنائے گئے ڈیزائن میں ضرورت تھی؟

ہزاروں دیمکیں جو بینائی سے محروم تھیں انہوں نے مل جل کر اس طرح کے فنکارانہ اور حیرت انگیز تعمیراتی کام میں کیسے کامیابی حاصل کی ہوگی؟

اگر آپ دیمکوں کے اس گھروندے کی تعمیر کے ابتدائی مرحلے ہی میں ان کے گھروندے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں اور پھر اسے دوبارہ جوڑ دیں تو آپ دیکھیں گے کہ تمام گزرگاہیں، نہریں
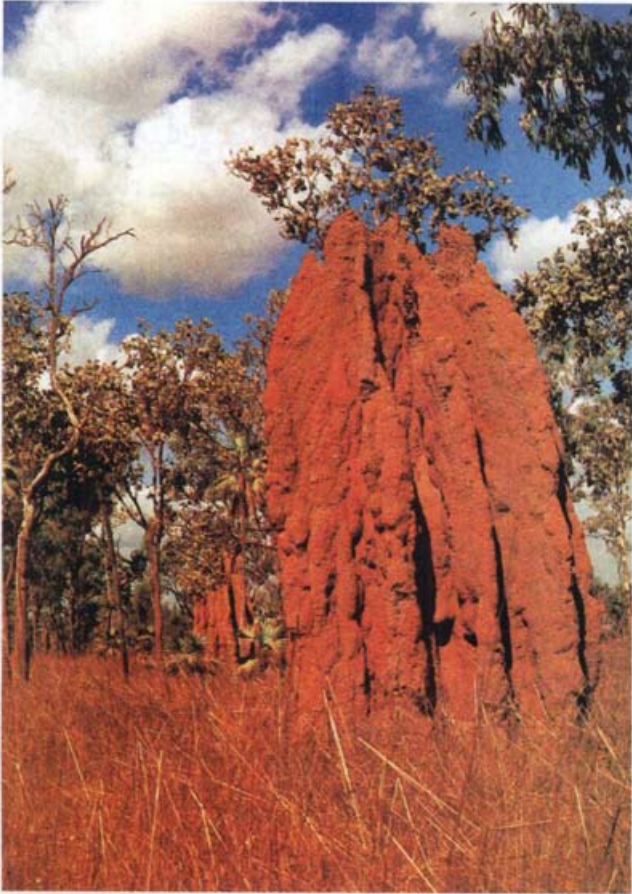
دیمک جو خود چند سینٹی میٹر سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی اوزار استعمال کیے بغیر کئی میٹر اونچے گھروندے تعمیر کر سکتی ہے۔ یہ خوبصورت اور قابل تعریف گھروندہ دیمکوں کی ایک ملین سے زیادہ آبادی پر مشتمل کالونی کو اپنے دشمنوں سے اور زندگی کو درپیش باہر کے نامساعد حالات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اور سڑکیں ایک دوسرے کے ساتھ باہم جڑ گئی ہیں۔ اس معجزاتی حد تک حیران کن واقعہ کو کس طرح بیان کیا جائے؟ انسانی عقل بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس مثال سے حاصل ہونے والا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ نے تمام جانداروں کو اُس وقت بے مثال طور پر تخلیق کیا جب ان کی مثال پہلے موجود ہی نہ تھی۔

ہد ہد

ہر کوئی جانتا ہے کہ ہد ہد اپنے گھونسلے درختوں کے تنوں میں چونچ سے سوراخ کر کے بناتا ہے۔ ہوسکتا ہے زیادہ لوگ یہ کہیں کہ یہ بات تو وہ پہلے سے جانتے ہیں لیکن جو بات زیادہ لوگ نہیں جانتے یا جس بارے میں انہوں نے کبھی غور نہیں کیا وہ یہ ہے کہ ہد ہد کو دماغ کا جریان خون کیوں نہیں ہوتا جبکہ وہ اپنے سروں سے اس قدر سختی کے ساتھ گودنے (TATTOO) کا کام لیتے ہیں۔ ہد ہد ویسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ کوئی انسان دیوار میں کیل اپنے سر کی مدد سے اتارنے کا کام لیتا ہے۔ اگر کسی انسان نے ایسا کام کیا ہوتا تو پہلے تو اسے دماغی صدمہ لاحق ہوتا پھر دماغ کا جریانِ خون۔ تاہم ہد ہد ایک درخت کے سخت تنے میں ۴۳-۳۸ مرتبہ صرف دو تین سیکنڈوں میں چونچ مار کر سوراخ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اسے اس لئے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ ہد ہد کے سر کی ساخت ایسی رکھی گئی ہے کہ وہ اس طرح کے کام سرانجام دے سکے۔ ہد ہد کی کھوپڑی میں ایک قابل ذکر معلق نظام رکھا گیا ہے جو ضرب یا چوٹ لگاتے وقت استعمال ہونے والی قوت کو کم کرتا اور اسے جذب کر لیتا ہے۔ اس کی پیشانی اور کھوپڑی کے کچھ عضلات جو اس کی چونچ اور جبڑوں کے جوڑوں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں، اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ وہ سوراخ کرتے وقت ہد ہد کی چونچ کی طاقتور ضربوں کے اثر کو کم کر دیتے ہیں۔

ڈیزائن اور منصوبہ بندی کی بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ ابتداً ہد ہد صنوبر کو ترجیح دیتا ہے، سوراخ کرنے سے قبل درخت کی عمر کو جانچتا ہے اور سو سال سے زیادہ عمر کے درختوں کا انتخاب کرتا ہے، اس لئے کہ جن درختوں کی عمر ۱۰۰ سال سے زیادہ ہو جائے ان میں ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے جس سے اکثر اوقات ان کی چھال سخت اور موٹی ہو جاتی ہے۔ اسے سائنس نے حال ہی میں دریافت کیا ہے اور آپ یقیناً یہ بات زندگی میں آج پہلی بار سن رہے ہوں گے مگر ہد ہد اسے صدیوں سے جانتا ہے۔

یہی وہ واحد سبب نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہد ہد صنوبر کو ترجیح دیتا ہے یہ پرندہ اپنے گھونسلے کے گرد درزیں کھود کر بنا لیتا ہے۔ شروع میں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ ان سے کیا مقصد حاصل کرتا ہے لیکن بعدازاں پتہ چلا کہ یہ درزیں اسے ایک بڑے خطرے سے بچاتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صنوبر میں سے ٹپکنے والا بیروزہ ان درزوں کو بھر دیتا ہے جس کی وجہ سے ہد ہد کے گھونسلے کی باہر والی چوکی اس بیروزے کا ایک چھوٹا سا تالاب پیدا کر لیتی ہے جو ہد ہد کو ان سانپوں سے بچاتا ہے جو اس کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔

ہد ہد کے خدوخال کے حوالے سے ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی زبان بے حد پتلی ہوتی ہے جو درختوں میں چیونٹیوں اور ایسے ہی دوسرے حشرات کے بلوں کے اندر تک چلی جاتی ہے۔ ان کی زبان لیسدار بھی ہوتی ہے جو ان کی مدد کرتی ہے کہ یہ بلوں کے اندر زبان ڈال کر چیونٹیوں کو خوراک بنالیں۔ ان کی تخلیق میں کس قدر جامعیت کا خیال رکھا گیا ہے اس کا اندازہ مزید اس حقیقت کے سامنے آنے سے ہو جاتا ہے کہ ان کی زبان کی ساخت ایسی ہوتی ہے جو چیونٹیوں کے جسموں میں موجود ترشے سے نقصان اٹھانے سے ان کو محفوظ رکھتی ہے۔

ہد ہد کی مختلف صفات کو درج بالا سطور میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ سب اس پرندے کے تفصیلی خدوخال کے حوالے سے ثابت کرتی ہیں کہ اس پرندے کو "تخلیق" کیا گیا ہے۔ اگر نظریۂ ارتقاء کے مطابق یہ ہد ہد محض اتفاق یا انطباق کے نتیجے میں عمل تغیر کے ذریعے وجود میں آئے ہوتے تو اس قسم کی غیر معمولی اور مستقل پائی جانے والی صفات حاصل کرنے سے پہلے ہی وہ مر گئے ہوتے۔ اور یوں ان کی نسل ختم ہو گئی ہوتی۔ تاہم اللہ نے اس پرندے کو ایک خاص "نمونے" کے ساتھ تخلیق کیا تھا جو اس کی زندگی سے مطابقت رکھتا تھا اس لئے اس نے تمام اہم صفات کی موجودگی میں زندگی گزارنی شروع کر دی تھی۔

بہروپ

اپنے دفاع کے لئے جانور جو طریقے اختیار کرتے ہیں ان میں سے ایک بہروپ یا بھیس بدلنا ہے۔ کچھ جانور ایسے ہیں جن کی جسمانی ساخت انہیں تحفظ دیتی ہے اور یہی ساخت ان کے مسکن یا جائے رہائش سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ان جانوروں کے جسموں اور مسکن میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ آپ جب ان کی تصاویر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ یہ فرق نہیں بتا سکتے کہ وہ پودا ہے یا جانور اور جانور کو اس کے ارد گرد کے ماحول میں پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ سانپ جو اپنے آپ کو ریت کے نیچے بہروپ کی شکل میں چھپا لیتا ہے، دشمنوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس سانپ نے خود اپنی جلد کے رنگ اور نمونے کو اپنے مسکن کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کر لیا ہو؟

بائیں جانب تصویر میں ایک
سانپ جھاڑیوں میں چھپا ہوا
ہے۔
جب آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ آپ کو جو شے ایک
دراصل ایک کیڑا ہے
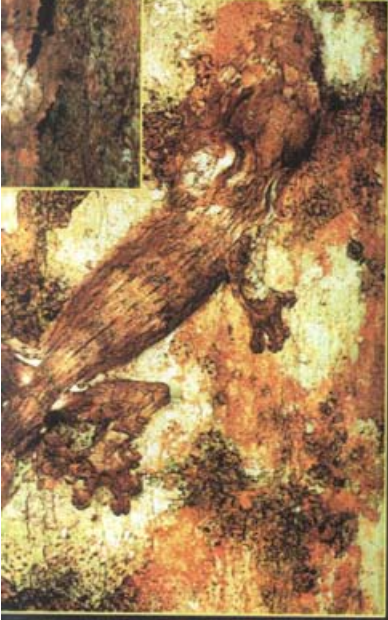
کچھ کیڑے مردہ اور
خشک پتوں کا سا روپ
دھار لیتے ہیں اسی لئے
پانامہ کیڑے کو خشک او
مرجھائے ہوئے پتوں
سے الگ پہچاننا مشکل
ہو جاتا ہے۔

ایک پرندے کے انڈے جسے ریت
سریلا کہتے ہیں اور جو اسی رنگ کے
ہوتے ہیں جس رنگ کا گردو پیش تاکہ
وہ دشمنوں سے بچ جائیں۔

یہ ایک گرگٹ ہے جسے گھریلو
چھپکلی کہتے ہیں، یہ اپنے گردو پیش
کا رنگ بس منٹ میں اختیار کر
لیتا ہے۔

ائی دیتی تھی وہ

یہ لاروا پانامہ کے بارشوں والے جنگلات میں رہتا ہے۔
اس پر سانپ کی آنکھوں جیسے داغ دھبے ہوتے ہیں جن
کی مدد سے یہ آسانی کے ساتھ چھپ جاتا ہے۔

چیونٹی خور پتوں کے درمیان چھپا
ہوا ہے کیا یہ آپ کو نظر آتا ہے؟

لاروا چونکہ اپنے جسم کو پتے کے بالکل درمیان میں
رکھ لیتا ہے اس لئے دشمنوں کی نظر سے بچ جاتا
ہے۔

دبیز حفاظتی غلاف میں لپٹی ہوئی گرگٹیں اپنے ماحول
کے مطابق رنگ نہیں بدلتیں اس لئے کہ ان کا رنگ تو
پہلے ہی ان کے مسکن سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

ے کی نوع پتے کی
لی ہونے کی وجہ سے
تمام دشمنوں سے
رہتی ہے
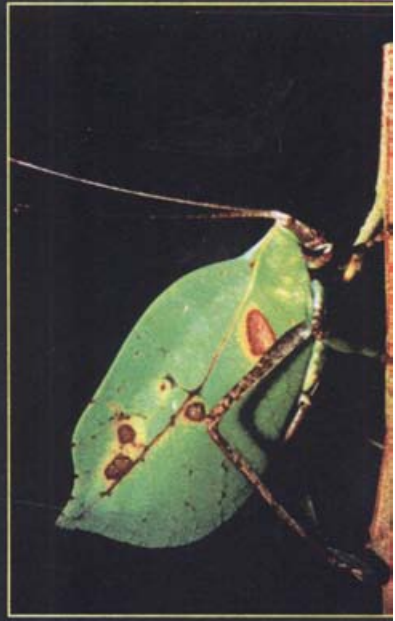
"Man" ایک ایسا
جو سامنے والے
ں پاؤں ہاتھوں کے
باندھ کر رکھتا ہے
عبادت کے وقت
ے جاتے ہیں اور اس
پھول کی پتیوں کی
ہوتے ہیں جو اسے
کو دھوکہ دینے میں
تے ہیں۔

...لطے میں ڈالنے والی آنکھیں حیران کر دیتی ہیں

...ب کچھ تتلیاں اپنے پر کھولتی ہیں تو ہمیں دو آنکھیں نظر آتی
...یں۔ یہ آنکھیں اُن کے دشمنوں کو یقین دلاتی ہیں کہ یہ تتلیاں
...یں ہیں۔ خصوصاً چند تتلیوں کی نوع کے مغالطے میں ڈالنے
...لے چہرے مثلاً اوپر نظر آنے والی Shonling تتلیاں اپنی
...کدار آنکھوں، چہرے کے خدو خال، چڑھی ہوئیں بھنووں،
...ن اور ناک کی وجہ سے اس قدر مکمل حالت میں ہوتی ہیں کہ
...ن کی جو مجموعی شکل بنتی ہے اس سے ان کے دشمنوں کو بڑی مایوسی
...وتی ہے۔ وہ شخص جو اللہ کے انکار کے نظریے پر ڈٹا ہوا ہے
...رتقاء پسندوں کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کر سکتا ہے کہ یہ ایک
...دلچسپ حسن اتفاق" ہے۔ یا وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "تتلی کا یہ
...ونہ جو اس کے جسم پر نظر آتا ہے وہ اس لئے اپنی خوشی سے اپنے
...اتھ لے آئی تا کہ یہ اس کے لئے مفید ثابت ہو سکے"۔ اگر کوئی
...خص اس طرح کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خوبصورت نمونے جو
...نکاروں کے مصورانہ شہپاروں پر بھی سبقت لے جاتے ہیں،
...خض حسن اتفاق یا انطباق کے نتیجے میں نظر آتے ہیں تو پھر عقل و
...انش رکھنے والے انسانوں کے پاس اس سلسلے میں کہنے کو کچھ بھی
...قی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے کہ اس طرح کے دعوے میں کوئی
...ستدلال یا عقل و شعور کی بات نہیں ملتی۔

درج ذیل صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ ایک کیڑے کی پتے کے ساتھ اس قدر مشابہت ہے کہ یہ پتا اسے دشمنوں سے بچاتا ہے کیونکہ وہ دشمنوں کو نظر ہی نہیں آتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے کیڑے نے اپنے جسم کو اس پتے کی شکل کا نہیں بنایا۔ ہوسکتا ہے اسے یہ علم ہی نہ ہو کہ وہ دشمنوں سے اس لئے محفوظ و مامون رہتا ہے کیونکہ وہ پتے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ تاہم بہروپ اس قدر مہارت اور چابکدستی سے بھرا گیا ہوتا ہے کہ یہ ایک منصوبہ بندی کے تحت دفاع اور حفاظت کی ترکیب ثابت ہوتا ہے اور یہ سب ''تخلیق'' کا کرشمہ ہے۔

مغالطے میں ڈالنے والی آنکھیں

جانوروں کی دنیا میں دفاع اور خود حفاظتی کے کچھ ناقابل یقین اور تصور سے ماورا دلچسپ طریقے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک مغالطے میں ڈالنے والی آنکھیں ہیں۔ اس قسم کی مغالطے میں ڈال دینے والی آنکھوں سے مختلف تتلیاں، لاروے اور مچھلیاں اپنے دشمنوں کو یقین دلاتی ہیں کہ وہ ان کے لئے ''خطرناک'' ہیں۔

جو تتلیاں بائیں طرف والی تصاویر میں نظر آ رہی ہیں انہیں جونہی کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ اپنے پر کھول لیتی ہیں اور ان کے دونوں پروں پر ایسی آنکھیں نمودار ہو جاتی ہیں جو ان کے دشمنوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

آیئے کچھ وقت ہم غور و فکر کو دیں۔ کیا اس قسم کی نہایت عمدہ طریقے سے اپنی موجودگی کا
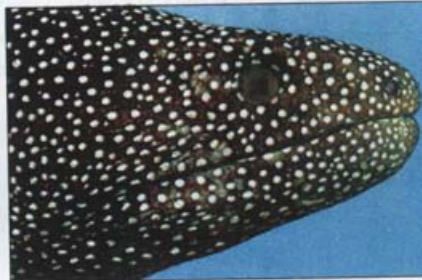
بائیں جانب: اصلی سر اور آنکھوں والی ستارہ ماہی جس کی پشت پر کانٹے ہوتے ہیں۔

دائیں جانب: وہ مچھلی جو اپنے ٹھکانے کے اندر تیر کر جاتی ہے اور اپنی دم باہر رکھتی ہے جس پر دو ''آنکھیں'' ہوتی ہیں۔ دوسری مچھلیاں اس کے قریب آنے سے اس لئے ڈرتی ہیں کیونکہ یہ مغالطے میں ڈالنے والی آنکھیں انہیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ یہ مچھلی جاگ رہی ہے۔

یقین دلانے والی آنکھیں حسن اتفاق یا انطباق کے نتیجے میں وجود میں آسکتی ہیں؟ تتلی کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب وہ اپنے پر کھولتی ہے تو دو ڈراؤنی آنکھیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ اور یہ کہ اس سے اُس کا دشمن خوفزدہ ہو جائے گا؟ کیا کبھی تتلی کو اپنے پروں پر بنے ہوئے یہ خوبصورت نمونے دیکھنے کا موقع ملا ہے تا کہ وہ یہ فیصلہ کرسکتی کہ یہ نمونہ خوفزدہ کرسکتا تھا اور وہ اسے خطرے کی گھڑی کے دوران استعمال کرسکتی تھی؟

اس قسم کا یقین دلانے والا نمونہ کبھی بھی اتفاق یا انطباق کے نتیجے میں وجود میں نہیں آسکتا تھا بلکہ یہ تو شعوری طور پر ہی ڈیزائن کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ بات کسی طرح بھی ذہن میں نہیں لائی جا سکتی کہ تتلی اس بات سے آگاہ ہوتی ہے کہ اس کے پروں پر اس قدر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ اسے ایک دفاعی حربے کے طور پر استعمال کرسکتی ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ اللہ جس نے یہ تتلی تخلیق کی ایسا خوبصورت نمونہ بھی اسی نے اس کے پروں کو عطا کیا اور اس جانور کی جبلت میں یہ بات رکھ دی کہ خطرے کے لمحات میں اسے استعمال کرسکے۔

آبی سوسن

چھوٹے چھوٹے پھولوں کو زیادہ تر لوگ معمولی سی چیزیں تصور کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ان پھولوں کے بارے میں یہ نہیں جانتے کہ یہ کس قدر مکمل اور جامع شکل میں ہوتے ہیں۔

ان پھولوں میں لوگوں کو تخلیق کی معجزانہ اور حیرت انگیز صناعی کیوں نظر نہیں آتی اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں یہ پھول کثرت سے ہر جگہ اور ہر روز دکھائی دیتے ہیں اس لئے وہ پھول جو ایک بالکل مختلف مقام پر اگیں، بالکل مختلف حالات میں اور سراسر مختلف سائز میں کھلیں، ان کو ''مانوسیت کی عینک'' کے بغیر دیکھا جائے گا اور اس سے اللہ کی موجودگی کا احساس کرنے میں مدد ملے گی۔

دریائے امیزن میں کھلنے والے آبی سوسن اس دریا کی تہ میں موجود لیسدار دلدل میں اگتے ہیں اس لئے لوگ ان کو ''مانوسیت کی عینک'' اتار کر دیکھتے ہیں۔ یہ پھول اس طرح نہیں کھلتے جس طرح لوگ ان کو ہر روز دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں بلکہ یہ ایک مختلف جدوجہد سے وجود میں آتے

ہیں اسی لئے لوگ انہیں حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہ پورے دریائے امیزن کی تہ میں اگتے اور پھر دریائے امیزن کی سطح آب تک آ جاتے ہیں۔ان کی منزل دھوپ میں پہنچنا ہوتا ہے جوان کی زندگی اور نشوونما کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ جب یہ سطح آب پر پہنچ جاتے ہیں توان کی نشوونمارک جاتی ہے اوران میں کانٹے دار گول کونپلیں نکل آتی ہیں۔ یہ کونپلیں پھر بڑے بڑے پتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جن کی لمبائی دو میٹر ہوتی ہے، ایسااس قدر مختصر وقت میں ہوتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس عمل میں دو گھنٹے گزرے ہوں۔ یہ ''جانتے ہوئے'' کہ وہ جس قدر زیادہ پتوں سے سطح دریا کو گھیر لیں گے، اسی قدر زیادہ وہ دھوپ سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔ یہ آبی سوسن بڑی فیاضی سے دن کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اورضیائی تالیف(Photosynthesis) کے عمل سے گزرتے ہیں۔

وہ ''جانتے'' ہیں کہ دریا کی تہ میں رہ کر روشنی کی کمی کی وجہ سے وہ زندہ نہ رہ سکیں گے یہ یقیناً ایک پودے کے لئے بڑی حوصلہ افزا بات ہوتی ہے کہ وہ ایسی ''دانشمندانہ'' ترکیب استعمال کر سکے۔

...وسن دلدل سے سطح آب تک راستہ بنالیتے ہیں اوران کی لمبائی دو میٹر ہو جاتی ہے ...ہ صرف اسی صورت میں وہ دن کی روشنی کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔تاہم ان پھولوں ...ڑوں کو بھی آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ بائیں جانب والی تصویر میں وہ ...ں نظر آرہی ہیں جو پودے کی جڑوں سے باہر نکل کرسطح آب پر آ جاتی ہیں اور ...تک آکسیجن پہنچاتی رہتی ہیں۔
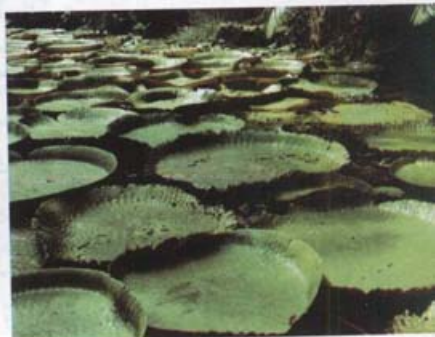
تاہم دھوپ ہی دریائے امیزن کے آبی سوسن کے لئے سب کچھ نہیں ہوتی انہیں اسی مقدار میں آکسیجن بھی چاہئے ہوتی ہے لیکن یہ بات عیاں ہے کہ دریا کی دلدلی تہ میں جہاں ان کی جڑیں ہوتی ہیں وہاں آکسیجن نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آبی سوسن اپنی جڑوں سے نکلنے والی ڈنڈیوں کو سطح آب کی طرف نمو پذیر کرتے ہیں جہاں ان کے پتے پانی پر تیرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ڈنڈیاں گیارہ میٹر تک لمبی ہو جاتی ہیں، وہ پتوں کے ساتھ بندھی ہوتی ہیں اور پتوں اور جڑوں کے درمیان آکسیجن اٹھا کر لے جانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔

ایک کونپل کو زندگی کے ابتدائی مراحل میں دریا کی گہرائیوں میں کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے آکسیجن اور دھوپ کی ضرورت ہے اور ان دونوں کی کمی کی وجہ سے وہ زندہ نہ رہ سکے گی اور یہ کہ اسے جس جس شے کی ضرورت ہے وہ سطح آب پر ہی مل سکتی ہے؟ وہ جاندار جو حال ہی میں زندگی سے روشناس ہوا ہو وہ نہ تو اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ یہ پانی ایک اختتامی مقام ہے نہ دھوپ اور آکسیجن کی موجودگی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

چنانچہ اِرتقاء پسندوں کے نکتہ نظر سے اس سارے معاملے کا اندازہ لگایا جائے تو ان پودوں کو تو بہت جلد ماحولیاتی حالات کے مقابلے میں شکست کھا کر ناپید ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کے باوجود آبی سوسن آج بھی اپنی تمام تر جامعیت کے ساتھ موجود ہیں۔

آبی سوسن کی ناقابلِ یقین حد تک جدوجہد ان کی روشنی اور آکسیجن تک رسائی کے لئے سطح آب پر پہنچ جانے کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ وہ اپنے بڑے بڑے پتوں کے کناروں کو اوپر کی جانب کنڈل دے دیتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچا سکیں۔

وہ ان تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ اپنی زندگیوں کو برقرار رکھ سکتے ہیں مگر یہ جانتے ہیں کہ یہی ان کی نسل کو آگے چلانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ انہیں کسی ایسے جاندار کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کا زردانہ (Pollen) ایک دوسرے آبی سوسن تک لے جائے اور یہ جاندار بھنورا (یا اسی قسم کا غلاف بردار کیڑا) ہوتا ہے جسے سفید رنگ کے لئے ایک خاص کمزوری کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ دریائے امیزن کے تمام دلکش پھولوں میں سے آبی سوسن کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ جب دریائے امیزن کے آبی سوسن کے پاس ملنے والے آتے ہیں تو اس سے ان کی نوع کو ایک تسلسل ملتا ہے۔ وہ اپنے تمام پر بند کر لیتے ہیں، ملنے آنے والوں کو قید کر کے ان کو زردانہ کافی مقدار میں پیش کرتے ہیں۔ وہ ان کو ایک رات اپنے پاس رکھتے اور پھر اپنا رنگ تبدیل کر لیتے ہیں تاکہ وہ اسی زردانے کو واپس ان کے پاس نہ لاسکیں۔ وہی آبی سوسن جو کبھی خالص سفید رنگ میں تھے اب دریائے امیزن کو گلابی رنگ سے سجا دیتے ہیں۔

کیا اس قسم کا نقص سے پاک اور اس عمدگی کے ساتھ منصوبہ بندی کا حامل کام کسی کونپل سے منسوب کیا جاسکتا ہے جو ہر شے سے بے خبر ہوتی ہے؟ بیشک نہیں...... یہ تو سارا کام اللہ کی دانائی کا ہی ہوسکتا ہے جس نے اسے تخلیق کیا۔ وہ تمام تفصیلات جن کا یہاں خلاصہ پیش کیا گیا یہ ظاہر کرتی ہیں کہ پودے اس کائنات کی دیگر چیزوں کی مانند نہایت سہل الحصول نظاموں کے ذریعے تخلیق کئے جاتے ہیں۔ اور ان کا خالق واحد صرف اللہ ہوتا ہے۔

خلاصہ: کیا انطباق یا محض اتفاق سے ایک جہاز وجود میں آسکتا ہے؟ مشہور ماہر طبیعیات سر فریڈ ہائل زندگی کی ابتداء کے بارے میں ایک زبردست تشبیہ پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "دانا و خردمند کائنات" (The Intelligent Universe) میں لکھتا ہے:

"یہ اتفاق کہ اعلیٰ زندگی کی شکلیں اس طرح وجود میں آگئی ہوں گی (اور ایسا محض اتفاق یا انطباق کی وجہ سے ہوا ہوگا) کا ایک دوسرے اتفاق کے ساتھ موازنہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک بگولے نے جو کوڑے کباڑ کے ایک ڈھیر میں سے گزر رہا تھا وہاں موجود ساز و سامان کو جوڑ کر ایک بوئنگ ۷۴۷ کھڑا کر دیا گیا ہوگا۔

ہائل کی یہ تشبیہ بے حد متاثر کن ہے۔ وہ مثالیں جن پر ہم نے درج بالا سطور میں بحث کی ہے یہ ظاہر کرتیں ہیں کہ زندگی کی موجودگی اور اس کے موجودہ نظاموں کی جامعیت ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اس عظیم قوت کی جانب دیکھیں تاکہ ہمیں وہ عظیم طاقت نظر آسکے۔ جس طرح

کوئی طوفان اتفاق یا انطباق کے نتیجہ کے طور پر ایک ہوائی جہاز نہیں بنا سکتا اسی طرح اس کائنات کے لئے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ غیر متوقع واقعات کے ساتھ از خود وجود میں آ جائے گی اور مزید یہ کہ وہ نہایت پیچیدہ اجسام کو اپنے اندر خود بخود سمو سکے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کائنات اَن گنت جزئیات کے ساتھ تخلیق کی گئی ہے اور اس کا موازنہ ایک جہاز کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

اس باب میں ہر وہ بات جو ہم نے کہی ہمارے سامنے نہ صرف قریبی گردوپیش کے ساتھ ایک نقص سے پاک منصوبہ بندی سمیت آ کھڑی ہوتی ہے بلکہ خلاء کی پہنائیوں کو بھی ساتھ لئے ہوتی ہے۔

ایک انسان اِن عیاں اور روشن نشانیوں کا اندازہ لگا سکتا ہے جو استدلال اور معقولیت دونوں بنیادوں پر رد نہیں کی جا سکتیں اور یہ ایک ہی نتیجے پر پہنچاتی ہیں: اس کائنات میں وجود میں آنے کے حوالے سے اتفاق یا انطباق کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اس لئے کہ یہ کائنات تو ان تمام جزئیات سمیت تخلیق کی گئی تھی جو اس کے اندر موجود ہیں۔

اور اللہ جو اس نقص سے پاک نظام کا خالق ہے وہ قادرِ مطلق ہے اور لامحدود علم وحکمت کا خزینہ بھی۔

سائنسدانوں نے اللہ کی نشانیوں کی تصدیق کی ہے

اب تک کی گئی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نے کائنات کے وجود میں آنے کے جو اسباب دریافت کئے ہیں وہ سب کے سب اللہ کی موجودگی کی شہادت دیتے ہیں۔ سائنس ہمیں اس نتیجے تک لے جاتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور یہ خالق قادر مطلق ہے، دانائی اور حکمت میں یکتا و بے مثال ہے۔ مذہب ہمیں اللہ کو جاننے میں راستہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہم ان حقائق کی تحقیق کرنے اور انہیں بہتر طور پر دیکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کی طرف مذہب ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

اس کے باوجود آج کچھ سائنسدان جو سائنس کے نام پر سامنے آتے ہیں بالکل مختلف مؤقف اختیار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سائنسی دریافتیں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ یہ کائنات اللہ نے تخلیق کی ہے۔ انہوں نے اس کے برعکس سائنس کی تفہیم کا ایک ملحدانہ تصوّر اپنا لیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ سائنسی معلومات کے توسط سے اللہ تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے ان کا دعویٰ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب دو باہم متصادم تصوّرات ہیں۔

دراصل یہ ملحدانہ تفہیم سائنس حال ہی کی پیداوار ہے۔ چند صدیاں پیشتر سائنس اور مذہب کبھی بھی ایک دوسرے سے متصادم تصوّر نہ ہوتے تھے اور سائنس کو ایک ایسا طریقہ تسلیم کیا جاتا تھا جو اللہ کی موجودگی کو ثابت کرتا تھا۔ یہ ملحدانہ تفہیم سائنس اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مادہ پرست اور غیر قیاسی فلسفوں کے بعد پھیلی جس نے دنیائے سائنس کے راستے سے یلغار کی۔

خصوصاً ۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے دعویٰ کے بعد ایسے حلقے جو دنیا کے بارے میں مادہ پرستانہ تصوّر رکھتے تھے اس نظریے کے دفاع کو نظریاتی بنیادوں پر دیکھنے لگے

تھے جسے وہ مذہب کے خلاف ایک متبادل نظریہ تصور کرتے تھے۔ نظریۂ ارتقاء کا استدلال یہ تھا کہ اس کائنات کو ایک خالق نے تخلیق نہیں کیا تھا بلکہ یہ تو اتفاقاً وجود میں آ گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دعویٰ کیا جانے لگا تھا کہ مذہب اور سائنس باہم متصادم تھے۔ برطانوی محققین Michael Baigent, Richard Leigh اور ہنری لنکن نے اس مسئلے پر اظہار خیال کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈارون سے ڈیڑھ سو سال قبل سائنس سے مذہب نے ترک تعلق نہیں کیا تھا بلکہ یہ تو اس کا ایک حصہ تھی اور اس کا حتمی مقصد اس کی خدمت تھی۔ تاہم ڈارون کے عہد سے سائنس اور مذہب میں دوری کا آغاز ہو گیا تھا اور سائنس نے اپنے آپ کو مذہب کا حریف مطلق اور نعم البدل قرار دے دیا تھا۔ یہ تین محققین بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس دور کے بعد انسانیت کے لئے مجبوراً ان دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ نام نہاد تقسیم جو سائنس اور مذہب کے درمیان ہوئی مکمل طور پر نظریاتی تھی۔ چند سائنسدان ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مادہ پرستانہ فلسفے کا پابند بنا لیا تھا اور وہ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں کئی نظریات وضع کر لئے تھے۔ سب سے زیادہ مشہور نظریۂ ارتقاء تھا اور یہی ان سب میں زیادہ اہم تھا۔ فلکیات کے شعبے میں بھی کچھ نظریات اختراع کر لئے گئے تھے مثلاً ''بتدریج وجود میں آنے کا نظریہ'' یا ''نظریۂ خلائے بسیط'' لیکن جیسا کہ ہم اس سے قبل کے ابواب میں بتا چکے ہیں کہ ایسے تمام نظریات جن میں تخلیق سے انکار کیا گیا تھا خود سائنس نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔

آج جو سائنسدان ابھی تک ان نظریات سے چمٹے ہوئے ہیں اور اپنے انکار پر مصر ہیں وہ مطلق العنانہ اور متعصّبانہ رویہ رکھنے والے لوگ ہیں جنہوں نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو اللہ کو نہیں ماننا۔ مشہور انگریز ماہر حیوانیات اور ارتقاء پسند ڈی ایم ایس واٹسن اس مطلق العنانیت کا اعتراف کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس نے اور اس کے رفقاء نے نظریۂ ارتقاء کو کیوں تسلیم کیا:

''اگر ایسا ہوا تو یہ نظریۂ ارتقاء کے متوازی ایک بین الاقوامی طور پر مسلمہ نظریہ پیش کرے گا، اس لئے نہیں کہ اسے منطقی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ سچ ہے بلکہ صرف اس لئے کیونکہ صرف نعم البدل، خصوصی تخلیق صاف اور واضح طور پر قابل یقین نہیں ہے''۔

واٹسن جب ''خصوصی تخلیق'' کہتا ہے تو اس کا اشارہ اللہ کی تخلیق کی طرف سمجھا جانا چاہیے۔

جیسا کہ اس کا اعتراف کیا گیا، یہ سائنسدان اسے "نا قابل تسلیم" سمجھتا ہے۔ مگر کیوں؟ کیا اس لئے کہ سائنس ایسا کہتی ہے؟ درحقیقت نہیں۔ اس کے برعکس سائنس تخلیق کی سچائی کو ثابت کرتی ہے واٹسن اس حقیقت کو نا قابل تسلیم کیوں سمجھتا ہے اس کا صرف ایک ہی سبب ہے، وہ یہ کہ اس نے اللہ کی موجودگی کا اعتراف نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے اور دیگر تمام ارتقاء پسند بھی اسی نقطہ نظر پر اڑے ہوئے ہیں۔

ارتقاء پسند سائنس پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ مادہ پرست فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ اور وہ سائنس کو مسخ کر کے اس فلسفے کے ساتھ متفق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ماہر جینیات اور بیباک ارتقاء پسند رچرڈ لیونٹن (Richard Lewontin) جو ہارورڈ یونیورسٹی سے وابستہ تھا اس سچائی کا اعتراف یوں کرتا ہے:

ایسا نہیں ہے کہ سائنس کے طریقے اور ادارے کسی طور ہمیں مجبور کرتے ہوں کہ ہم مظاہراتی دنیا کی مادی تشریح تسلیم کرلیں بلکہ اس کے برعکس ہم تو مادی اسباب کے ساتھ استدلالی وابستگی پہلے ہی رکھتے ہیں جو تحقیق کے لئے ایک آلہ بناتے ہیں اور چند ایسے نظریات رکھتے ہیں جو مادی تشریحات فراہم کرتے ہیں، خواہ یہ جس قدر بھی غیر وجدانی اور غیر مسلمہ باتوں کے لئے پراسرار کیوں نہ ہوں۔

اس کے برعکس آج، جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، ایسے سائنسدانوں کا مطلق العنان مادہ پرست گروہ بھی موجود ہے جو اللہ کی موجودگی کی تصدیق کرتا ہے اور سائنس کو اس ذات باری تعالیٰ کو جاننے کا ایک ذریعہ تصور کرتا ہے۔ امریکہ میں کچھ نئے رویے وجود میں آئے ہیں جن میں سے "خلاق" (Creationism) یا "دانشمندانہ ڈیزائن" (Intelligent Design) سائنسی شہادت سے ثابت کرتے ہیں کہ تمام جاندار اشیاء کو اللہ نے تخلیق کیا ہے۔

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سائنس اور مذہب معلومات کے متصادم ماخذ نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس سائنس ایک ایسا طریقہ ہے جو مذہب کی فراہم کردہ صداقتوں اور سچائیوں کی تصدیق کرتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے درمیان تصادم صرف ان چند مذاہب میں درست سمجھا جاتا ہے جن میں توہم پرستی کے عناصر اور ربانی ماخذ یکجا ہو گئے ہیں۔ مگر اسلام میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو صرف خالص وحی الٰہی پر یقین رکھتا ہے مزید یہ کہ اسلام تو بطور خاص سائنس کو تحریک دیتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ کائنات میں تلاش و جستجو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے اللہ کی

تخلیق کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی درج ذیل سورۃ اس مسئلے کی جانب توجہ مبذول کراتی ہے:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ○ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ○

"اچھا تو کیا کیوں انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں۔ یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں۔ ہر اس بندے کے لئے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ برتہ لگتے ہیں"۔ (سورۃ ق: ۶-۱۰)

جیسا کہ اوپر دی گئی قرآنی سورۃ سے پتہ چلتا ہے قرآن ہمیشہ لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، استدلال سے کام لینے اور اس دنیا کی کھوج لگانے کی ترغیب دیتا ہے جس میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہے کیونکہ سائنس مذہب کی حمایت کرتی ہے اور انسان کو جہالت ولاعلمی سے محفوظ رکھتی اور اسے زیادہ دانشمندی سے سوچنے پر اکساتی ہے۔

یہ کتاب تو انسانی فکر کی دنیا کے دریچے کھول دیتی ہے اور اس کائنات میں روشن وعیاں اللہ کی نشانیوں کے ادراک میں مدد دیتی ہے۔ نامور جرمن ماہر طبیعات میکس پلینک نے کہا کہ "ہر وہ فرد جو قطع نظر اس بات کے کہ یہ اس کا میدان نہیں، سائنس کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کرتا ہے وہ سائنس کے معبد کے دروازے پر یہ عبارت ضرور لکھی ہوئی پڑھتا ہے: "یقین سے کام لو"۔ اس کے مطابق یقین ایک سائنسدان کی لازمی صفت ہے۔

اب تک جتنے مسائل پر ہم نے بحث کی ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات اور اس میں موجود جاندار اشیاء کو اتفاقات یا انطباقات سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ایسے سائنسدان جنہوں نے دنیائے سائنس کے لئے راستہ کا تعین کیا اب بھی اس عظیم صداقت کی تصدیق کرتے

ہیں جوں جوں اس کائنات کے بارے میں لوگ زیادہ جانتے ہیں توں توں اس کے بے نقص نظم اور ترتیب کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہرنئی جزئیات جو دریافت ہوتی ہے بلا استفسار اس کی حمایت کرتی ہے۔

ہم جوں ہی اکیسویں صدی میں قدم رکھتے ہیں جدید ماہرین طبیعات کی اکثریت تخلیق کی صداقت تسلیم کرنے لگتی ہے۔ ڈیوڈ ڈارلنگ بھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ابتداء میں وقت، خلاء، مادہ، توانائی نہ ہی ایک چھوٹا سا نقطہ یا ایک جوف موجود تھی۔ پھر قدرے تیز حرکت ہوئی اور ایک معتدل تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ اور ایک تغیر ظہور پذیر ہوا۔ ڈارلنگ اپنی بات تو یہ کہتے ہوئے ختم کرتا ہے کہ جب اس کائناتی صندوق کو کھولا گیا تو اس کے نیچے سے تخلیق کے معجزاتی برگ وریشے نمودار ہوئے۔

اس کے علاوہ یہ بات پہلے سے ہی لوگوں کے علم میں ہے کہ سائنس کے تقریباً تمام مختلف شعبوں کے بانی اللہ اور اس کی مقدس کتابوں پر ایمان رکھتے تھے۔ تاریخ میں سب سے بڑے ماہر طبیعات نیوٹن، فریڈے (Faraday)، کیلون (Kelvin) اور میکسویل (Maxwell) ایسے سائنسدانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ایک عظیم ماہر طبیعات آئزک نیوٹن کے عہد میں سائنسدان اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اجرام فلکی اور سیاروں کی گردشوں کو مختلف قوانین کے ذریعے واضح کیا جا سکتا تھا۔ تاہم نیوٹن کا عقیدہ یہ تھا کہ کرۂ ارض اور خلاء کا خالق ایک ہی ہے اس لئے ان کی تشریح ایک ہی جیسے قوانین کے ذریعے کی جانی چاہئے تھی۔ اس نے اس نقطہ نظر کو اپنی کتاب میں یوں وسعت دی کہ سورج اور سیاروں کا جامع اور بے نقص نظام صرف اس صورت میں زندہ رہ سکتا تھا اگر وہ کسی طاقتور اور دانا ہستی کے زیر نگرانی و تسلط ہوتا۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں سائنسدان جو زمانہ وسطیٰ سے طبیعات، ریاضی اور فلکیات میں تحقیق کر رہے تھے، سب کے سب اس نکتے پر متفق ہیں کہ اس کائنات کو کسی واحد خالق نے تخلیق کیا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اسی نکتے پر توجہ مرکوز کئے رہے۔ طبیعاتی فلکیات کے بانی Johannes Kepler نے اپنی ایک کتاب میں خدا پر اپنے یقین محکم کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں بطور خدا کے غریب اور نالائق خدام کے، اس کی دانائی کی عظمت اور اس کی طاقت کو دیکھنا ہے اور پھر اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔

عظیم ماہر طبیعات ولیم تھامپسن (لارڈ کیلون) جس نے حرحرکیات (Thermodynamics) کی بنیادرکھی اور جو عیسائی تھا، خدا پر ایمان رکھتا تھا۔ اس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور اسے مسترد کر دیا تھا۔ اس نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل مختصراً اس بات کی وضاحت کی کہ جب سائنس زندگی کے آغاز پر نگاہ ڈالتی ہے تو وہ ایک عظیم قوت کی موجودگی کی تصدیق کر دیتی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات کے پروفیسر رابرٹ میتھیوز نے اس حقیقت کا اظہار اپنی کتاب مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں کیا ہے جہاں وہ بیان کرتا ہے کہ ڈی این اے سالمے اللہ نے تخلیق کئے تھے۔ اس کے خیال میں یہ تمام مراحل ایک واحد خلیے سے لے کر ایک چھوٹے سے بچے تک پوری ہم آہنگی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور بالآخر نوجوانی کے عہد تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان تمام واقعات کی وضاحت ایک معجزے سے کی جاسکتی ہے جیسا کہ حیاتیات کے مختلف مراحل میں ہوتا ہے۔ میتھیوز یہ سوال کرتا ہے کہ اس قدر جامع اور پیچیدہ سالمہ کیسے ایک سادہ اور بہت چھوٹے سے خلیے سے وجود میں آسکتا ہے اور ایک جلیل القدر انسان ایک خلیے سے کیسے پیدا ہوسکتا ہے جو حرف تہجی آئی (i) پر ڈالے گئے نقطے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ سوائے ایک معجزے کے کچھ بھی نہیں ہے۔

کچھ دوسرے سائنسدان جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات کو ایک خالق نے بنایا ہے اور جنہیں ان کی اپنے اپنے شعبے میں خدمات کے ذریعے پہچانا جاتا ہے یہ ہیں:

رابرٹ بوائل (Robert Boyle) (جدید کیمیا میں بابا تصور کیا جاتا ہے) Jona William Petty (شماریات اور جدید اقتصادیات کے مطالعہ کے لئے مشہور تھا) گریگوری مینڈیل (Gregory Mendel) جینیات کا باپ تھا جس نے ڈارونیت کے نظریے کو مسترد کیا تھا اور ایسا کرنے میں جنیات کی سائنس میں اس کی بڑی خدمات ہیں۔

لوئیس پیسچور (Louis Pasteur) (بیکٹر ولوجی میں ایک بڑا نام ہے، اس نے ڈارونیت کے خلاف جنگ لڑنے کا آغاز کر دیا تھا)

جان ڈالٹن (جوہری نظریے کا باپ)

Blaise Pascal (ایک نہایت اہم ریاضی دان)

جان رے (John Ray) (برٹش نیچرل ہسٹری کے لئے ایک بے حد اہم اور بڑا نام)

نکولس سٹینو (Nicolus Steno) دونوں نہایت اہم اور مشہور ماہرین طبقات شناسی جنھوں نے زمین کی تہوں کا پتہ لگایا۔

(Carolous Linnaeus) (حیاتیاتی تقسیم کا باپ)

جارج کوویر (Georges Cuvier) (تقابلی علم تشریح الاعضاء کا باپ)

میتھیو مارے (بانی بحریات)

تھامس اینڈرسن (ان ابتدائی لوگوں میں سے ہے جنھوں نے اطلاقی کیمیا کے شعبے میں تعلیم حاصل کی۔

سائنسی حقائق اور قرآن کا معجزہ

اللہ نے ۱۴سو سال قبل قرآن نازل کیا تھا۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اس کے باوجود اس کے متن میں کچھ سائنسی تشریحات شامل ہیں۔ ان تشریحات نے جدید سائنسی دریافتوں کی تردید کبھی نہیں کی۔ اس کے برعکس کچھ ایسے حقائق جو صرف بیسویں صدی کی ٹیکنالوجی کی مدد سے ہی دریافت ہو سکتے تھے قرآن حکیم میں ۱۴۰۰ سال قبل دے دیئے گئے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن ایک نہایت اہم ثبوت ہے جو اللہ کی موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔

کائنات قرآن کی نظر میں

جو اعداد و شمار بیسویں صدی میں حاصل ہوئے ان کی روشنی میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ یہ کائنات عدم سے، چند لمحوں بعد اچانک وجود میں لائی گئی تھی۔ اس نظریے کو بگ بینگ نظریے کا نام دیا گیا اور اس کے ذریعہ پتہ چلا کہ یہ کائنات ایک دھماکے سے وجود میں آئی تھی۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں ''عدم سے وجود تک'' کے عنوان کے تحت اس نظریے کا مطالعہ تاریخ اور سائنسی ثبوت کے تناظر میں کیا۔ اس باب میں ہم یہ دیکھیں گے کہ اللہ نے اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں کیسے چند سائنسی حقائق کو قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے۔

بگ بینگ نظریے کی حمایت میں ایک بہت مضبوط ثبوت موجود ہے۔ ان میں سے ایک کائنات کی توسیع ہے اور اس کا نہایت اہم ثبوت یہ ہے کہ کہکشائیں اور اجرام فلکی ایک دوسرے سے دور ہٹتے رہے۔ اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے یہ فرض کر لیجئے کہ کائنات کی مثال اس غبارے کی سطح جیسی ہے جسے ہوا میں چھوڑا گیا ہو۔ جس طرح غبارے کی سطح پر موجود نقطے اس وقت

ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں جس وقت غبارے کو ہوا میں چھوڑا جاتا ہے اسی طرح جوں جوں کائنات وسیع ہوتی ہے خلاء میں موجود اشیاء ایک دوسرے سے دور ہوتی جاتی ہیں۔

اس مقام پر آیئے قرآنی سورۃ سے رجوع کرتے ہیں۔ جس میں کائنات کی تخلیق کے متعلق یوں ارشاد باری تعالیٰ ہوا ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ o وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ o

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں''۔ (سورۃ الذّٰریٰت: ۴۷، ۴۸)

ایک اور سورۃ میں جہاں آسمانوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے، فرمایا:

اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ط وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے''۔ (سورۃ الانبیاء: ۳۰)

بنیادی لفظ ''رَتق'' ہے جس کا ترجمہ ''باہم ملے ہوئے'' کیا گیا جس کا مطلب عربی لغت میں یہ ہے ''ہر وہ شے جو ٹھوس ہو، قریب قریب ہو، ناممکن الدخل اور ٹھوس جسم میں باہم جوڑ دی گئی ہو''۔ یعنی یہ کہ اسے ایسے دو ٹکڑوں میں استعمال کیا جاتا ہے جن سے مل کر ایک اکائی بنا دی گئی ہے۔ بیان میں جہاں ''جدا کیا'' آتا ہے وہاں لفظ ''فتق'' استعمال ہوا ہے جو عربی میں بطور فعل استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب کسی شے کو ''رَتق'' کی صورت میں جدا جدا کرنا ہے۔ مثال کے طور پر بیج کا اگنا اور زمین پر جس وقت یہ نمودار ہوتا ہے اسے اس فعل کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ آیئے ایک بار پھر اس قرآنی سورۃ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اس میں وہ حالت بیان کی گئی ہے جس میں آسمانوں اور زمین کو ''رَتق'' کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ پھر ان کو فعل ''فتق'' کے استعمال سے ''جدا کیا'' بتایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر جدا ہو گیا اور اپنا راستہ بنا کر باہر آ گیا۔ بیشک جب ہمیں بگ بینگ کے لمحہ اوّل کے بارے میں یاد کرایا گیا تو ہمیں وہ نقطہ دکھائی دیتا ہے جسے کائناتی بیضہ کا نام دیا گیا جس میں کائنات کے تمام مادے بند تھے۔ یہاں تک کہ ''آسمان و

زمین'' جو ابھی تخلیق نہیں کیئے گئے تھے اس نقطے کے اندر حالت ''رتق'' میں موجود تھے۔ بعد ازاں جب یہ کائناتی بیضہ پھٹا تو تمام مواد ''فتق'' کی حالت میں آ گیا تھا۔

جب ہم اس قرآنی سورۃ کی تشریحات کا موازنہ سائنسی دریافتوں کے ساتھ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے یہ کس قدر دلچسپی کی بات ہے کہ یہ تمام دریافتیں بیسویں صدی کی ہیں۔

آسمانوں کی تخلیق

سٹیون وینبرگ (Steven Weinberg) نے جو ''پہلے تین منٹ'' (First Three Minutes) نامی کتاب کا مصنف تھا ایک بار کہا تھا کہ اگر کوئی شخص آسمان پر ایک طائرانہ نظر ڈالے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ یہ ایک سختی کے ساتھ ''غیر متبدل کائنات'' ہے۔ بیشک بادل تیرتے ہوئے چاند کے چہرے پر آ جاتے ہیں، آسمان کا نیلگوں گنبد قطبی ستارے کے گرد گھومتا ہے خود چاند میں طویل وقت کے لئے گھٹنے بڑھنے کا عمل جاری رہتا ہے اور چاند اور سیارے ایک ہموار سطح میں سے حرکت کرتے ہوئے گزرتے ہیں جس کا تعین ستارے کرتے ہیں۔ تاہم یہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو ہمارے نظام شمسی کے اندر مقامی سطح پر ظہور پذیر ہونے والی گردشوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

وینبرگ اس بات کا اضافہ بھی کرتا ہے کہ سیاروں سے پرے ستارے ساکن و جامد دکھائی دیتے ہیں۔

بیشک آسمان پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی جائے تو یہ احساس ہو سکتا ہے کہ ہر شے بے حد مستحکم اور ثابت قدم ہے۔ مگر پھر بھی معاملہ مختلف ہے آسمان میں ایک بہت بڑی سرگرمی موجود ہے اور اس حقیقت کو جسے انسانی آنکھ پہچان نہیں سکتی صدیوں پہلے قرآن حکیم میں بیان کر دیا گیا تھا۔

قرآن حکیم میں بہت سی سورتیں ہیں جن میں آسمان کا ذکر ہے ان میں سے زیادہ تر میں آسمان کو جمع ظاہر کیا گیا ہے۔ لفظ ''سمٰوٰت'' کے معنی ''آسمانوں'' کے ہیں جس کا مفہوم عربی زبان میں زمین کا کرۂ ہوائی اور خلاء دونوں ہے۔

پہلا نکتہ جس پر ہم یہاں بحث کریں گے وہ لفظ ''آسمانوں'' کا جمع کا استعمال ہے۔ یہ جمع کا صیغہ قرآن کے معجزات میں سے ایک ہے۔ آیئے ہم اس کی تشریح کر دیں کہ ایسا کیوں ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى
اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔
”وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا
وہ فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ
”ہوجا“ اور وہ ہوجاتی ہے“
(سورۃ البقرۃ: ۱۱۷)

فرض کیجئے آپ کھلی ہوا میں جاتے ہیں اور اپنا سر اوپر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ہیں۔ آپ کو کیا دکھائی دے گا؟ اگر موسم گرما ہوا تو آپ کو یا تو نیلگوں آسمان نظر آئے گا یا ہوا میں تیرتے ہوئے کچھ بادل دکھائی دیں گے؛ اور اگر موسم سرما ہو تو بھورے رنگ کا دھندلا دھندلا آسمان نظر آئے گا جس پر بادل چھائے ہوئے ہوں گے۔ آپ جو کچھ دیکھیں گے اُس میں آپ کو وہ فضا نظر نہیں آئے گی جس نے دنیائے بسیط کو گھیر رکھا ہے۔ آپ کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ یہ فضا کئی تہوں سے مل کر بنی ہے قرآن میں جب اس تفصیل میں جا کر ذکر ہوتا ہے جہاں انسانی آنکھ اسے دیکھ بھی نہیں سکتی تو یہ بہت بڑا ثبوت بن جاتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝

''جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی''۔ (سورۃ الملک: ۳-۴)

خلاء کو ایک وسیع کھوکھلی جگہ تصور کیا جا سکتا ہے: ایک لامحدود وسیع کھوکھلی جگہ، جس کے اندر ستارے، سیارے اور دوسرے اجرام فلکی ہیں جو گردش کر رہے ہیں۔ تاہم خلاء کوئی ایسی کھوکھلی جگہ نہیں ہے جسے اس کے اپنے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ ایک ''نظام'' ہے جس کے اندر اَن گنت ستارے ہیں، شمسی نظام ہیں، سیارے اور سیٹلائٹ ہیں اور دُم دار ستارے ہیں۔ صدیوں پہلے قرآن حکیم میں بتا دیا گیا تھا کہ آسمانوں کو اور خلاء کو بے نقص ایک ''عظیم قرینے'' کے اندر تخلیق کیا گیا ہے:

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝

''اچھا تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے''۔ (سورۃ ق: ۶)

ستارے اور سیارے

آیئے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ لفظ ''ستارہ'' جو قرآن میں آیا ہے اس سے کیا مراد ہے۔ ستاروں کے لئے قرآن میں لفظ ''نجم'' (ستارہ) اور ''قندیل'' (چراغ) استعمال ہوا ہے۔ قرآنی سورتوں کے مطابق ان کے دو بنیادی کام ہیں۔ یہ روشنی کا ذریعہ ہیں اور جہازرانی کے دوران ان سے مدد لی جاتی ہے۔

بالخصوص وہ سورتیں جن میں روز قیامت یا یوم حشر کا ذکر آتا ہے، وہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ستاروں کی روشنی بجھا دی جائے گی اور یہ مدھم پڑ جائے گی۔ جب سورج کا ذکر آتا ہے جو ایک ستارہ ہی ہے تو لفظ ''قندیل'' استعمال کیا گیا ہے۔ جن ستاروں نے آسمان کو سجا رکھا ہے ان کے لئے بھی لفظ ''قندیل'' استعمال ہوا ہے۔ تاہم جب چاند کے لئے لفظ ''نور'' (روشنی) استعمال کیا گیا تو ایک اہم فرق رکھا گیا۔ اس طرح سے ستارے اور دوسرے اجرام فلکی جو ستارے نہیں ہیں ان کے درمیان فرق بتایا گیا ہے۔ یہ حقیقت جو چودہ سو سال قبل تک معلوم نہ تھی یہی قرآن کے معجزات میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآنی سورتوں میں ان کے بارے میں مذکور ہے کہ ان سے دوسرا کام یہ لیا جاتا ہے کہ یہ جہازرانی میں سمت بتانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان تمام سورتوں میں لفظ نجم استعمال کیا گیا ہے۔ بیشک قطب نما کی ایجاد سے قبل جس نے زمانہ وسطیٰ میں جغرافیائی دریافتوں میں بڑا اہم کردار ادا کیا، رات کے سفر کے دوران جہازرانی میں صرف ستاروں سے ہی مدد لی جا سکتی تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ستارے سمت بتا سکیں؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ ایک خاص ترتیب اور قرینے سے اپنی اپنی جگہ ٹانک دیئے گئے ہوں۔ اگر کوئی ستارہ ایک شب ایک سمت میں دکھائی دے اور دوسری شب کسی دوسری سمت میں تو پھر راستے کی سمت کا تعین اس سے نہ کیا جا سکے گا۔ وہ خاص خاص مقامات جہاں آسمان پر ستارے نمودار ہوتے ہیں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا ذکر قرآن حکیم میں یوں آیا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝

''پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے''۔

(سورۃ الواقعہ:۷۵-۷۶)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔
”قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی“
(سورۃ الذّٰریٰت:7)

شمس وقمر

قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں سورج اور چاند کا ذکر ہے۔ بڑی دلچسپ خاصیت منکشف ہوتی ہے جب ہم ان کے لئے عربی لفظ کی تلاش کرتے ہیں۔ان آیات میں سورج کے لئے الفاظ ''سراج'' (لیمپ) اور ''وھاج'' (زیادہ روشنی کے ساتھ جلتا ہوا) استعمال ہوئے ہیں۔ چاند کے لئے لفظ ''منیر'' (اجالا کرنے والا، چمکدار) استعمال ہوا۔ بیشک سورج کافی مقدار میں حرارت اور روشنی پیدا کرتا ہے جو اس کے اندر جوہری ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔اور چاند صرف اس روشنی کو منعکس کرتا ہے جو یہ سورج سے حاصل کرتا ہے۔قرآنی سورۃ اس فرق کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاo وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًاo

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ برتہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟'' (سورۃ نوح:۱۶-۱۵)

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًاo وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًاo

''اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کئے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا''۔ (سورۃ النبا:۱۳-۱۲)

تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًاo

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا''۔ (سورۃ الفرقان:۶۱)

سورج اور چاند میں جو فرق ہے اس کا ذکر ان آیات میں بالکل واضح طور پر آگیا ہے۔ایک کو روشنی کا منبع اور دوسرے کو روشنی منعکس کرنے والا کارندہ دکھایا گیا ہے۔ان زمانوں میں اس قسم کی تفصیل کا جاننا ناممکن تھا۔اس قسم کا علم انسانوں تک صدیوں بعد ہی پہنچ سکتا تھا۔اس لئے یہ حقیقت کہ یہ معلومات پہلے سے قرآن حکیم میں موجود تھی اس بات کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ نے نازل کیا ہے۔آیئے اب ہم اپنی توجہ اجرام فلکی کی ایک اور اہم صفت کی جانب مبذول کرتے ہیں جو خلاء میں ان کی گردشوں کی ہے۔

قرآن میں مذکور محور

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اجرام فلکی خلاء میں گردش کررہے ہیں۔ان کی گردش مکمل طور پر ایک پابندی اور کنٹرول کے اندر ہے اور یہ تمام اجرام فلکی ایک تخمینے اور حساب کے ساتھ ایک محور میں گردش کرتے ہیں۔قرآن حکیم کی جن سورتوں میں سورج اور چاند کا حوالہ آیا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔

”سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں“۔(سورۃ الرحمٰن:۵)

ایک جگہ اور یوں ارشاد فرمایا:

لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔

”نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں“۔(سورۃ یٰسین:۴۰)

ایک اور سورۃ میں اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔

”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں“۔(سورۃ الانبیاء:۳۳)

حال ہی میں ایک نظریہ تسلیم کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے اجرام فلکی چھوٹے اجرام فلکی پر قوتِ کشش ثقل استعمال کرتے ہیں۔مثلاً چاند زمین کے گرد ایک مدار یا محور بناتا ہے جس کا حجم اس سے زیادہ ہے۔زمین اور دوسرے سیارے نظام شمسی میں ایک مدار کے اندر سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ایک مزید بڑا نظام،جس کے گرد نظام شمسی ایک مدار بناتا ہے بھی وجود رکھتا ہے۔اس ساری تفصیل میں سب سے نازک مسئلہ یہ ہے کہ ان ستاروں،سیاروں اور دوسرے اجرام فلکی میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کی گردش کنٹرول میں نہ ہو۔وہ ایک دوسرے کے مدار میں داخل نہیں ہو سکتے،نہ ہی ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔

قرآن حکیم ان اجرام فلکی کی ہم آہنگ و مربوط گردش کا ذکر یوں کرتا ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔

''قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی'' (سورۃ الذّریٰت:۷)

سورج جو کائنات کے اربوں ستاروں میں سے ایک ہے، خلاء میں ایک دن میں ۷ ملین کلو میٹر سے زیادہ سفر کرتا ہے۔ سورج کے اس سفر کو اللہ نے قرآن پاک میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّلَّهَا ط ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔

''اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے''۔ (سورۃ یٰسین:۳۸)

ایک نہایت محفوظ چھت

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ۔

''اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ مگر یہ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے''۔ (سورۃ الانبیاء:۳۲)

کم و بیش ہر ایک نے چاند کی سطح کی تصویریں دیکھی ہیں۔ اس کی سطح بے حد غیر ہموار ہے جس کی وجہ وہ شہاب ثاقب ہیں جو اس پر گر چکے ہیں۔ ان شہاب ثاقب سے اس پر جو گڑھے پڑ گئے وہ چاند کی قابل ذکر خصوصیات میں سے ایک ہے۔ چاند کی سطح پر قائم کیا جانے والا کوئی بھی خلائی مستقر یا رہائشی مقام ذراسی بداحتیاطی سے بنایا گیا تو وہ بہت جلد زمین بوس ہو جائے گا۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ اس کی ''حفاظت'' کس طرح کی جائے۔

یہ تفصیل جس کے بارے میں ہم نے کبھی نہیں سوچا، زمین کے لئے بڑے قدرتی انداز میں فراہم کی گئی ہے۔ اس لئے لوگوں کو زندہ و سلامت رہنے کے لئے اضافی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شہاب ثاقب، خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے، زمین پر پہنچتے ہی تباہ ہو جاتے ہیں۔ زمین خلاء ہی میں ان کی ضرر رساں شعاعوں کو چھان لیتی ہے اور یوں انسانی زندگی کے مزید قائم رہنے کے لئے ایک اہم عمل سرانجام دیتی ہے۔ بہت سی مزاحمتی اور مہلک شعاعیں سورج اور ستاروں سے زمین تک پہنچ جاتی ہیں۔ خصوصاً توانائی کے دھماکے جن کو ''لشکارے'' کہتے

سورج کے ان لشکاروں کے درمیان ایک خوںناب بادل کو اوسطاً ۱۵۰۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے خلاء میں پھینکا جاتا ہے۔ یہ خوںناب بادل مثبت برقی قوت والے پروٹونوں اور منفی برقی قوت والے الیکٹرانوں سے مل کر بنتا ہے۔ یہ برقی حوالے سے موصلی ہوتا ہے۔ جب یہ بادل ۱۵۰۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار کے ساتھ زمین پر پہنچتا ہے تو یہ زمین کے گرد موجود مقناطیسی میدان کے اثر سے برقی رو پیدا کرنے لگتا ہے۔ دوسری طرف زمین کا یہ مقناطیسی میدان خوںناب پر دھکیلنے کی قوت استعمال کرتا ہے جس کے اندر برقی رو گردش کر رہی ہوتی ہے۔ یہ قوت بادل کی حرکت کو روک دیتی ہے اور اسے ایک خاص فاصلے پر رکھتی ہے۔ آیئے اب ہم خوںناب بادل کی اس قوت پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو زمین پر پہنچنے سے قبل ''رک'' گئی ہے۔

یہ خوںناب بادل زمین کے مقناطیسی میدان کی حراست میں آ جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کے اثرات کا زمین سے ادراک کیا جا سکتا ہے۔ شدید شعلے بلند ہوتے ہیں، زیادہ وولٹیج والی لائنوں میں ٹرانسفارمر پھٹ سکتے ہیں، مواصلات کا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے اور برقی نیٹ ورک کا فیوز اڑ سکتا ہے۔
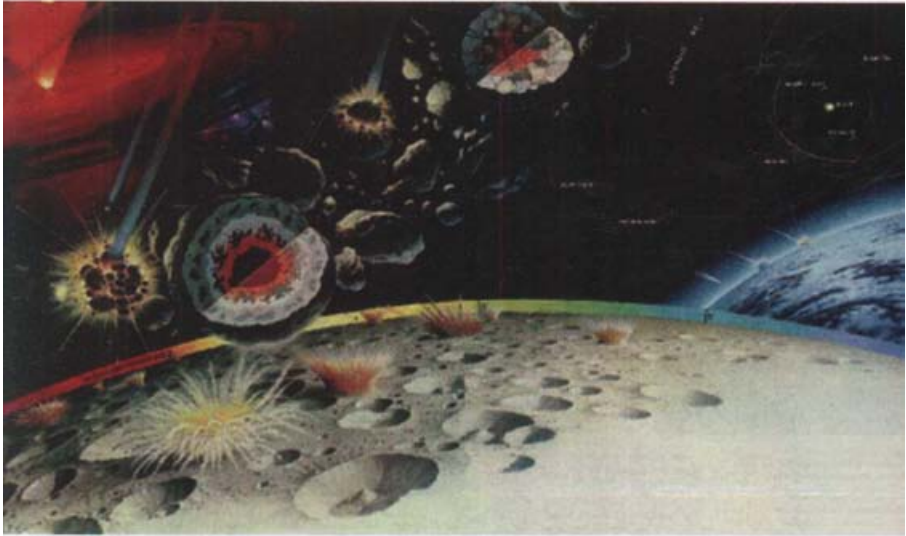
اگر یہ ''محفوظ چھت'' نہ ہوتی تو وہ خطرات جو زمین کے منتظر تھے اس قدر کم نہ ہوتے جس قدر اس تصویر میں دکھائے گئے ہیں۔

سورج کے اندر جو دھماکہ ہوتا ہے اس سے خارج ہونے والی توانائی کا تخمینہ لگایا گیا تو یہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم (دھماکے سے ۵۸ گھنٹے بعد) کی ۱۰۰ بلین مرتبہ زیادہ توانائی کے برابر تھی۔ قطب نما کی سوئی پر ایک انتہائی ہلچل دکھائی دی تھی اور درجہ حرارت فضا میں ۲۵۰ کلو میٹر کی بلندی تک ۲۵۰۰ سی تک ایک ہی جست میں پہنچ گیا تھا۔

ایک اور لہر سورج سے نسبتاً کم رفتار کے ساتھ نکلتی ہے جو تقریباً ۴۰۰ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اسے "شمسی ہوا" کہتے ہیں۔ ان شمسی ہواؤں کو ایک تہ کنٹرول کرتی ہے جسے وان ایلن تابکاری پٹی (VAN ALLEN BELT) کہتے ہیں جو زمین کے مقناطیسی میدان کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ دنیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں۔ اس تہ کی تشکیل کرۂ ارضی کی کوکھ کی خصوصیات سے ممکن ہوئی۔ یہ کوکھ اپنے اندر مقناطیسی دھاتیں مثلاً لوہا اور نکل رکھتی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مرکز بچہ (Nucleus) دو مختلف اجسام سے مل کر بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اندر کا حصہ ٹھوس اور باہر کا سیال ہوتا ہے۔ قلب یا کوکھ کی دونوں تہیں ایک دوسرے کے گرد گھومتی ہیں۔ اس حرکت سے دھاتوں میں ایک مقناطیسی اثر پیدا ہوتا ہے جو مقناطیسی میدان کو تشکیل دیتا ہے۔ وان ایلن تابکاری پٹی (Van Allen Belt) اس مقناطیسی میدان کی توسیع ہوتی ہے جو کرۂ ہوائی سے باہر دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ مقناطیسی میدان ان خطرات سے زمین کو محفوظ رکھتا ہے جن کا خلاء کی طرف سے خدشہ رہتا ہے۔ شمسی ہوائیں مذکورہ پٹی میں سے نہیں گزر سکتیں، جو زمین سے ۴۰۰۰۰ میل دور ہوتی ہے۔ جب شمسی ہوائیں ذرات کی بارش کی شکل میں اس مقناطیسی میدان سے ملتی ہیں تو تحلیل ہو کر اسی پٹی کے گرد بہنے لگتی ہیں۔

وان ایلن پٹی کی مانند زمین کا کرۂ ہوائی بھی خلاء کے تباہ کن اثرات سے زمین کو محفوظ رکھتا ہے۔ ہم یہ ذکر پہلے کر چکے ہیں کہ کرۂ ہوائی شہاب ثاقب سے زمین کو محفوظ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر خلاء میں ۲۷۳ ڈگری حرارت جسے "مطلق صفر" کہتے ہیں لوگوں کے لئے مہلک اثر رکھتی ہے لیکن کرۂ ہوائی اسے دور رکھتا ہے۔

زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ کرۂ ہوائی صرف بے ضرر شعاعوں، ریڈیائی لہروں اور نظر آنے والی روشنی کو آنے دیتا ہے کیونکہ یہ زندگی کے لئے ضروری عناصر ہوتے ہیں۔ وہ بنفشی شعاعیں ہیں اور جو سورج میں واقع ہوتے ہیں، جو زمین کے نزدیک ترین رہنے والا ستارہ ہے وہی ان ضرر رساں شعاعوں کو پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔

جنہیں کرۂ ہوائی صرف جزوی طور پر آنے دیتا ہے پودوں کی ضیائی تالیف (Photosynthesis) اور تمام جانداروں کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ یہ شعاع ریزی جو سورج سے زمین کی طرف شدت کے ساتھ خارج کی جاتی ہے وہ کرۂ ہوائی کی اوزون تہ میں چھان لی جاتی ہے اور اس کا محدود سا مطلوبہ حصہ زمین تک پہنچتا ہے۔ سورج کی شعاعیں ضروریات زندگی میں سے ہیں۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر ایک ایسا عمدہ نظام کام کر رہا ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے اور باہر کے خطرات سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں زمین کی اس حفاظتی حالت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ۔

”اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ مگر یہ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے“۔ (سورۃ الانبیاء:۳۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساتویں صدی میں کرۂ ہوائی کی حفاظتی خاصیت کے بارے میں یا وان ایلن پٹی کے بارے میں علم رکھنا ناممکن تھا۔ ”محفوظ چھت“ کے الفاظ ان حفاظتی عاملین کے بارے میں نہایت جامع اور خوبصورت تشریح کرتے ہیں، جو زمین کے گرد پائے جاتے ہیں اور جن کو صرف جدید عہد میں دریافت کیا گیا۔ چنانچہ درج بالا سورۃ جس میں قرآن نے آسمانوں کو محفوظ چھت کا نام دیا ہے یہ بتاتی ہے کہ قرآن کو خالق نے نازل کیا جو ہر شے کا علم رکھتا ہے اور کائنات کی ہر شے کا خالق ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

اضافیتِ زماں

آج اضافیتِ زماں ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت ہے۔ تاہم اس صدی کی ابتداء تک جبکہ آئن سٹائن نے اسے ”نظریۂ اضافیت“ کا نام نہیں دیا تھا کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وقت اضافی بھی ہوسکتا ہے جو سمتی رفتار اور کمیت پر انحصار کرتا ہے۔

گو ایک استثنیٰ کے ساتھ مگر قرآن نے اضافیتِ زماں کے علم کو تسلیم کیا ہے۔ اس حوالے سے تین آیات یہ ہیں:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ط وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ

كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

”یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے“۔ (سورة الحج:۴۷)

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

”وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے“۔ (سورة السجدہ:۵)

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۔

”ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے“۔ (سورة المعارج:۴)

قرآن ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا نزول ۶۱۰ء میں شروع ہوا، قرآن اضافیت کو اس قدر صاف صاف بیان کر رہا ہے کہ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ یہ الہامی کتاب ہے۔

زمین گول ہے

قرآن حکیم عربی زبان میں نازل ہوا جو ایک بے حد وسیع اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس میں ذخیرۂ الفاظ بہت زیادہ ہے اور الفاظ کے کئی کئی معانی و مطالب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان کے کچھ فعل ایسے ہیں جن کا ایک واحد لفظ کے طور پر کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر فعل ”حشیہ“ کے معنی عظمت وجلال سے خوفزدہ ہونا ہیں۔ (دوسری قسم کے خوف کے لئے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں) یا لفظ ”قارعة“ کا استعمال ”ایک حادثے“ کے معنوں میں ہوتا ہے، وہ جس میں ٹکرانا شامل ہو یعنی یوم حشر۔

ان میں سے ایک فعل ”تکویر“ ہے۔ انگریزی میں اس کے معنی ہیں ”تہ بہ تہ کرنا یا گرد لپیٹنا“۔ مثال کے طور پر عربی لغات میں یہ لفظ ایسے فعل کے لئے استعمال ہوتا ہے جو گول اشیاء کی جانب اشارہ کرے جیسے پگڑی باندھنا۔ آیئے اب ہم ایک ایسی سورة پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ
رِّزْقِهٖ ط وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔
”وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع کر رکھا ہے۔ چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ
خدا کا رزق، اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے“۔
(سورۃ الملک: ۱۵)

میں فعل ''تکویر'' استعمال ہوا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ ۔

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے''۔ (سورۃ الزمر:۵)

اس آیت میں دن اور رات کو ایک دوسرے پر لپیٹ دینے کے علم کی جو بات بتائی گئی ہے اس میں دنیا کے گول ہونے کے بارے میں بھی صحیح صحیح معلومات فراہم کی گئی ہے۔ یہ صورت حال صرف اس وقت درست ہو سکتی تھی جب یہ زمین گول ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم میں زمین کے گول ہونے کا حوالہ موجود تھا۔

تاہم وقت کے بارے میں علم کا ادراک مختلف طریقے سے کیا گیا۔ جیسا کہ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ اس بات کے بارے میں پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین ایک چپٹا سیارہ ہے۔ اور تمام سائنسی تخمینے اور تشریحات اسی عقیدے پر مبنی تھیں۔ تاہم قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اس لئے کائنات کا ذکر کرتے وقت نہایت صحیح الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

پہاڑ کس کام آتے ہیں

علم ارضیات کے مطابق پہاڑ ان بڑی بڑی پلیٹ نما چٹانوں کے آپس میں ٹکرانے اور ان کی حرکت کے نتیجے میں وجود میں آئے، جن سے سطح زمین بنی تھی یہ اس قدر بڑی ہیں کہ ان کے اندر تمام براعظم سما گئے ہیں۔ جب یہ دو پلیٹ نما چٹانیں باہم ٹکراتی ہیں تو عموماً ایک دوسری کے نیچے پھسل کر چلی جاتی ہیں اور درمیانی ملبہ جمع ہو کر ڈھیر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ملبہ جب اپنے ہی بوجھ سے دب جاتا ہے تو اونچے اونچے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں جو گردونواح کی زمین کی نسبت زیادہ اونچے ہوتے ہیں۔ اس اثناء میں باہر کو نکلی ہوئی زمین جس سے پہاڑ بنتے ہیں زیر زمین چلی جاتی ہے اور کچھ سطح زمین پر رہ جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑوں کا کچھ حصہ نیچے کی طرف پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ یہ حصہ نظر آتا رہے۔ یہ پہاڑی سلسلے جو زیر زمین چلے جاتے ہیں زمین کی پوست کو معدنی یا نامیاتی مادے کی تہوں یا اپنی ہی تہوں کے درمیان پھسل کر چلے جانے سے روکتے ہیں۔ جیسا کہ یہ تشریح واضح کرتی ہے پہاڑوں کی ایک سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ یہ

زمینی پلیٹوں کے ان اتصالی مقامات کی تشکیل کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب آنے کی وجہ سے سختی کے ساتھ دب جاتے ہیں اور انہیں ایک جگہ جم کر کھڑا ہونے کی صورت میں لے آتے ہیں۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہاڑ میخوں کا کام دیتے ہیں جو میخیں کہ لکڑی کے ٹکڑوں کو باہم جوڑ دیتی ہیں۔

مزید یہ کہ پہاڑ قشر ارض پر اس قدر بوجھ ڈالتے ہیں کہ زمین کی کوکھ میں حرکت نہیں ہوتی نہ زیر زمین سے کچھ سطح زمین پر آتا ہے اور یوں زمین کی چھاتی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہتی ہے۔ زمین کی مرکزی تہ جسے زمین کا قلب کہتے ہیں ایک ایسا علاقہ ہے جس میں اس قسم کے مواد پائے جاتے ہیں جو ہزاروں درجے کی حرارت پر پگھلتے ہیں زمین کے قلب میں حرکت ہو تو اس سے اس کے کچھ ایسے خطے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، جو ان زمینی پلیٹوں کو تشکیل دیتے ہیں جن سے کرۂ ارض بنتا ہے۔ان خطوں میں جو پہاڑ تشکیل پاتے ہیں وہ اوپر کی جانب اٹھنے والی ہر حرکت کو روک لیتے ہیں اور زمین کو شدید زلزلوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ بات بے حد دلچسپ ہے کہ وہ تکنیکی حقائق جو آج ہمارے عہد میں جدید علم ارضیات نے دریافت کئے صدیوں پہلے قرآن پاک نے منکشف کر دیئے تھے۔ پہاڑوں کے بارے میں ایک قرآنی سورۃ میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ۔

”اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تا کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے،اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے“۔

(سورۃ لقمان:۱۰)

اس آیت میں قرآن نے اس وقت کے تسلیم کئے جانے والے توہم پرستانہ عقیدے کی تردید کی ہے۔اپنی ہمعصر بہت سی اقوام کے قدیم فلکیاتی علم کی مانند عربوں کا بھی خیال تھا کہ آسمانوں کو پہاڑوں کی بلندی کے اوپر کھڑا کیا گیا تھا۔(یہ روایتی عقیدہ تھا جس میں بعد ازاں کائنات کے ذکر کے حوالے سے عہد نامہ عتیق میں اضافہ کر دیا گیا تھا)اس عقیدے کے مطابق چپٹی زمین کے دونوں کناروں پر بلند و بالا پہاڑ تھے۔ یہ آسمانوں کو ”سہارا“ دیئے ہوئے تھے۔ یہ ایک طرح کے ستون تصوّر کئے جاتے تھے جو آسمانوں کو ان کی جگہ پر سہارا دے رہے تھے۔محولہ بالا

آیت نے اس عقیدے کی تردید کرتے ہوئے یہ مؤقف پیش کیا کہ آسمان بغیر کسی ستون اور ٹیک کے اپنی جگہ قائم تھے۔ پہاڑوں کا ارضیاتی حوالے سے اصل کام بھی بیان کر دیا گیا: زلزلوں سے زمین کو محفوظ رکھنا۔ ایک اور سورۃ اسی بات کو اس طرح بیان کرتی ہے:

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۔

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تا کہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں''۔ (سورۃ الانبیاء: ۳۱)

بارش

زمین پر زندگی کا وجود برقرار رکھنے کے لئے نہایت اہم عناصر میں سے ایک بارش ہے۔ یہ کسی خطۂ زمین پر سرگرمیوں کے تسلسل کی بنیادی ضرورت ہے۔ بارش انسانوں سمیت تمام جانداروں کے لئے اہم حیثیت کی حامل ہے، اس کا ذکر قرآن حکیم کی مختلف آیات میں آیا ہے، جہاں بارش کیسے ہوتی ہے، اس کا تناسب کیا ہوتا ہے اور اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ وہ معلومات تھیں جو اس زمانے کے لوگوں تک کبھی بھی نہ پہنچ پاتیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

آیئے قرآن حکیم میں بارش سے متعلق دی گئی معلومات کا جائزہ لیتے ہیں۔

بارش کی مقدار اور تناسب

سورۃ الزخرف کی گیارویں آیت میں بارش کو پانی کہا گیا ہے جو ایک ''خاص مقدار'' میں برسایا جاتا ہے۔ آیت اس طرح سے ہے:

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ۔

''جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو جلا اٹھایا۔ اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کئے جاؤ گے''۔ (سورۃ الزخرف: ۱۱)

جس ''مقدار'' کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اس سے بارش کی دو صفات کا پتہ چلتا ہے۔ پہلی

تو یہ کہ زمین پر برسنے والی بارش کی مقدار ہمیشہ ایک جتنی ہوتی ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق ایک سیکنڈ میں ۱۶ ملین ٹن پانی کے بخارات زمین سے اٹھتے ہیں۔ یہ مقدار ایک سیکنڈ میں زمین پر برسنے والے پانی کی مقدار کے برابر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پانی ایک توازن کے ساتھ ایک ''مقدار'' کے اندر گردش میں رہتا ہے۔

ایک اور مقدار بارش کے پانی کی رفتار کے بارے میں ہے۔ بارش برسانے والے بادلوں کی کم از کم بلندی ۱۲۰۰ میٹر ہوتی ہے۔ جب اتنی اونچائی سے گرایا جائے تو بارش کے ایک قطرے کے وزن کے برابر کسی شے کی رفتار مسلسل تیز تر ہوتی جاتی ہے اور یہ زمین پر ۵۵۸ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پہنچتی ہے۔ یقیناً اس رفتار کے ساتھ زمین پر گرنے والی شے بڑا نقصان پیدا کرے گی۔ اگر بارش بھی اسی طرح زمین پر گرتی تو تمام فصلیں تباہ ہو جاتیں، رہائشی آبادیاں، مکانات، موٹر گاڑیاں نقصان اٹھاتیں، لوگ اضافی احتیاطی تدابیر کئے بغیر باہر نہ نکل سکتے تھے۔ پھر یہ تخمینہ تو ان بادلوں کے بارے میں لگایا گیا ہے جو ۱۲۰۰ میٹر کی بلندی پر ہیں، ایسے بھی تو بادل ہوتے ہیں جو ۱۰,۰۰۰ میٹر کی اونچائی سے بارش برساتے ہیں۔ بارش کا ایک قطرہ جو اس قدر بلندی سے گرے گا اس کی رفتار بھی بڑی تباہ کن ہوگی۔

مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ قطرے جس بلندی سے بھی گریں، بارش کے پانی کے قطروں کی اوسط رفتار اس وقت ۱۰-۸ کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جب وہ زمین پر گرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شکل ایک خاص طرح کی ہوتی ہے۔ اس خاص شکل سے کرۂ ہوائی کی رگڑ کا اثر بڑھ جاتا ہے اور اس سے رفتار میں ایک خاص حد رفتار کے بعد تیزی نہیں آتی۔ (آج کل اسی تکنیک کو استعمال کرکے پیراشوٹ بنائی گئی ہے)۔

بارش کی ''مقدار'' سے متعلق بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ان ہوائی تہوں میں جہاں سے بارش برسنا شروع ہوتی ہے درجہ حرارت ۴۰° سی تک گر سکتا ہے۔ اس کے باوجود بارش کے قطرے کبھی بھی برف کے ذرّات میں تبدیل نہیں ہوتے۔ (زمین پر جانداروں کے لئے یہ ایک مہلک خطرہ ثابت ہو سکتا تھا) اس کا سبب یہ ہے کہ کرۂ ہوائی میں پانی خالص ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ خالص پانی بہت کم درجہ حرارت پر بھی جمتا نہیں ہے۔

بارش کی یہ شکل کیسے بنتی ہے؟

لوگوں کے لئے ایک طویل عرصے تک یہ ایک بہت بڑا معمہ بنا رہا کہ بارش کی یہ شکل کیسے بنتی ہے۔ صرف موسمی ریڈار کی ایجاد کے بعد یہ معلوم کیا جاسکا کہ بارش موجودہ شکل تک پہنچتے پہنچتے کن مراحل سے گزرتی ہے۔

بارش اپنی شکل تک تین مراحل سے گزرتی ہے۔ پہلے مرحلے میں بارش کا ''خام مواد'' ہوا میں اٹھتا ہے۔ پھر بادل بنتے ہیں اور تیسرے اور آخری مرحلے میں بارش کے قطرے نمودار ہوتے ہیں۔

ان مراحل کا قرآن پاک میں صاف صاف ذکر ہے۔ صدیوں پہلے بارش کی شکل تک کے مراحل کو مختصراً بیان فرمایا گیا تھا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ۔

''اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں۔ پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکا یک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں''۔ (سورۃ الروم: ۴۸)

آیئے ہم ان تین مراحل پر نظر ڈالتے ہیں جن کا اس سورۃ میں ذکر آیا ہے۔

پہلا مرحلہ: ''اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے......''

سمندروں میں جھاگ کے ذریعے بیشمار ہوا کے بلبلے مسلسل بنتے اور پھٹتے رہتے ہیں۔ اس عمل سے پانی کے ذرّات سمندر سے نکل کر آسمان کی طرف جاتے رہتے ہیں۔ ان ذرّات میں نمک بہت ہوتا ہے انہیں ہوائیں اپنے دوش پر لئے کرۂ ہوائی میں پہنچا دیتی ہیں۔ یہ ذرّات جن کو 'ایروسول' (Aerosols) کہا جاتا ہے اپنے اردگرد پانی کے بخارات جمع کر کے بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ایک بار پھر سمندروں سے ننھے ننھے قطروں کی شکل میں ایک خاص میکانکی عمل کے ذریعے کرۂ ہوائی کی طرف اٹھتے ہیں، اس عمل کو ''آبی پھندا'' (Water Trap) کہا جاتا

ہے۔

دوسرا مرحلہ: ''......اور وہ بادل اٹھاتی ہیں ...... پھر وہ جس طرح چاہتا ہے ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے''۔

بادل ان آبی بخارات سے متشکل ہوتے ہیں جو نمک کے بلوروں (Crystals) یا ہوا میں خاک کے ذرّات کے گرد منجمد ہو جاتے ہیں۔ ان میں موجود پانی کے قطرے چونکہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں (ان کا قطر ۰.۰۱ اور ۰.۰۲ ایم ایم کے درمیان ہوتا ہے) اس لئے بادل ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں اور پھر آسمان پر پھیل جاتے ہیں یوں مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: ''...... پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آ رہے ہیں......'' آبی بخارات جو نمک کے بلوروں اور مٹی کے ذرّات کے گرد جمع ہوتے ہیں موٹے ہو کر بارش کے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ بارش کی صورت میں زمین پر برسنے لگتے ہیں۔

بارش کی شکل تک کے ہر مرحلے کو قرآنی سورتوں میں بتا دیا گیا۔ مزید یہ کہ ان مراحل کو صحیح ترتیب میں بیان کیا گیا۔ جیسا کہ اس کائنات کے دیگر قدرتی مظاہر کا ذکر کیا گیا، قرآن ہی ہے جس نے اس مظہر قدرت کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ صدیوں قبل جب لوگ ان حقائق سے بے خبر تھے اور سائنس نے بھی یہ باتیں دریافت نہ کی تھیں قرآن نے ان حقائق سے پردہ اٹھایا تھا۔
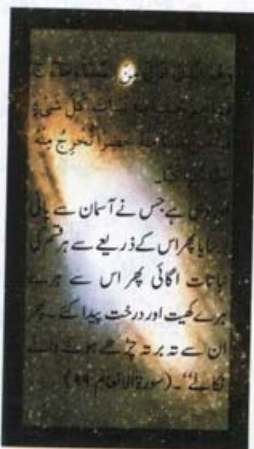
ایک مردہ زمین کو زندگی مل گئی

قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں بارش کے کام کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی گئی۔ اور یہ بتایا گیا کہ یہ ''ایک مردہ زمین کو زندگی دیتی ہے''۔ ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًاo لِنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًاo

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ
شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ○ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ
وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○
وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا جس سے
تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لئے بھی
چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اگاتا ہے
اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا
کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو
غور و فکر کرتے ہیں"۔ (سورۃ النحل: ۱۱-۱۰)

''پھر آسمان سے پاک پانی نازل کرتا ہے تاکہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے''۔ (سورۃ الفرقان:۴۹-۴۸)

زمین کو پانی مہیا کرنے کے علاوہ، جو جاندار مخلوق کی بہت بڑی ضرورت ہے، بارش کا ایک اور کام زمین کو زرخیزی دینا ہے۔ بارش کے قطرے جو سمندروں سے آبی بخارات کی شکل میں اٹھ کر بادلوں کا روپ دھارتے ہیں ان میں کچھ مواد ایسا ہوتا ہے جو ایک مردہ علاقے کو ''زندگی دیتا ہے''۔ ان ''حیات بخش'' قطروں کو ''سطح زمین کے تناؤ کے قطرے'' کہا جاتا ہے۔ یہ قطرے سمندر کی سطح آب کے سب سے اوپر والے حصے میں تشکیل پاتے ہیں جسے ماہرین حیاتیات نے تہ خورد کا نام دیا ہے۔ یہ تہ جو ایک ملی میٹر کے دسویں حصے سے بھی کم پتلی ہوتی ہے، اس میں بہت سے نامیاتی پس خوردہ رہ جاتے ہیں جن کی تشکیل خوردبینی کائی اور چھوٹے آبی جانوروں (Zooplankton) سے پیدا کردہ آلودگی کرتی ہے۔ ان پس خوردوں میں سے کچھ اپنے اندر سے چند ایسے عناصر منتخب اور جمع کر لیتے ہیں جو سمندری پانیوں میں بہت نایاب ہوتے ہیں مثلاً فاسفورس، میگنیشم، پوٹاشیم، اور چند بہت بھاری دھاتیں مثلاً تانبا، جست، کوبالٹ (Cobalt) اور سیسہ۔ ان قطروں کو جو اپنے اندر ''زرخیزی'' لئے ہوئے ہوتے ہیں ہوائیں آسمان کی طرف لے جاتی ہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد یہ قطرے بارش کے قطروں کے ساتھ مل کر زمین پر برستے ہیں۔ زمین پر بیج اور پودے، بیشمار دھاتی نمکیات اور ایسے عناصر جو ان کی نشو ونما کے لئے ضروری ہوتے ہیں ان قطروں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس بات کو ایک قرآنی آیت میں اس طرح منکشف کیا گیا:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝

''اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا، پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بر تہ لگتے ہیں''۔ (سورۃ ق:۱۰-۹)

وہ نمکیات جو بارش کے ساتھ زمین پر گرتے ہیں اور (کیلشیم، میگنیشم، پوٹاشیم وغیرہ) کچھ کھادیں اس کی چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں جن کو زرخیزی زمین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری

دنیا میں زندگی گزارنے والے ہر انسان کی انگلیوں کے نشان مختلف ہوتے ہیں۔

جانب وہ بھاری دھاتیں ہیں جو اس قسم کے ایروسولز (Aerosols) میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کچھ عناصر ایسے ہیں جو پودوں کی نشوونما اور پیداوار کے لئے زرخیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ایک بنجر زمین کے پودوں کو جو ضروری عناصر درکار ہوتے ہیں وہ بارش کے ساتھ ان کھادوں کے گرنے سے ۱۰۰ سال تک کے عرصے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ ان سمندروں کی تہ میں پائے جانے والے ایروسول کی مدد سے جنگلات بھی پھلتے پھولتے اور خوراک حاصل کرتے ہیں۔ یوں ہر سال ۱۵۰ ملین ٹن کھاد پوری زمین پر گرتی ہے۔ اگر اس قسم کی قدرتی کھاد نہ ہوتی تو زمین پر سبزہ وگل بہت کم مقدار میں اگتے اور ماحولیاتی توازن بھی بگڑ گیا ہوتا۔

زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حقیقت جس تک جدید سائنس اب پہنچی اسے اللہ نے صدیوں قبل قرآن حکیم میں بیان فرما دیا تھا۔

بارور ہوائیں

قرآن حکیم میں ہواؤں کو ''بارور'' کے طور پر منکشف کیا گیا ہے:

وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

''بارور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں''۔ (سورۃ الحجر: ۲۲)

عربی میں لفظ ''بارور'' سے پودوں اور بادلوں دونوں کی باروری مراد لی جاتی ہے۔ جدید سائنس نے ہواؤں کے بارے میں بتایا کہ ہواؤں میں یہ دونوں خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہوائیں اپنے ساتھ بلوروں (کرسٹلز) کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور ان بادلوں کو بارور کرتی ہیں۔ یہ بلور بارش کے قطرے بنانے میں حصہ لیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ پودوں کو بھی بارور کرتی ہیں۔

انسانوں اور جانوروں کی طرح زمین پر بہت سے پودوں میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں میں اہلیت ہوتی ہے کہ وہ تولید کی خاطر حرکت کرتے ہیں لیکن پودوں کو یہ ذرائع حاصل نہیں ہوتے کہ وہ ہم صحبت ہونے کے لئے ایک دوسرے کے قریب جاسکیں۔ اس مسئلے کو ہوائیں حل کر دیتی ہیں۔ نر اور مادہ پودوں کے تولیدی خلیے ہوائیں ایک دوسرے کے پاس لے جاتی ہیں اور یوں اس زمین پر پودوں کی زندگی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔

زیادہ تر پودے اس قدر مثالی انداز میں تخلیق کئے جاتے ہیں کہ وہ ہوا میں سے زردانے پکڑ لیتے ہیں۔ گل پنج ہزاری، لٹکتے ہوئے پھول اور کچھ دوسرے ایسی نہریں بناتے ہیں جو ہوائی لہروں کی جانب کھلتی ہیں۔ ایسے زردانے جن میں تولیدی مادہ ہوتا ہے تولیدی خطوں میں پہنچ جاتے ہیں اور اس کے لئے ان نہروں کا ان کو شکر گزار ہونا چاہئے پودے تولیدی مادے سے آراستہ زردانوں کے بیجوں کو ہوا میں پھینکتے ہیں۔ بعد میں ہوا کی لہریں ان بیجوں کو اسی نوع (Species) کے پودوں تک لے جاتی ہیں جب یہ زردانہ بیضہ دان تک پہنچتا ہے تو بیضے کو بارور کر دیتا ہے اور اس طرح بیضہ دان بیجوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

انگلیوں کے بے مثال نشانات

وہ ''انگلی کا نشان'' جو انگلی کے سرے پر بنا ہوا ہوتا ہے اور جس کا ایک خاص نمونہ جلد کے اوپر دکھائی دیتا ہے انگلی کے مالک کے لئے بے مثال ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کی انگلیوں کے نشانات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ تاریخی شخصیات جو اس دنیا میں آئیں سب کی انگلیوں کے نشانات (Finger Prints) مختلف تھے۔ جب تک کوئی بڑا زخم نہ آجائے انگلیوں کے نشانات ایک شخص کی زندگی میں کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نشانات کو ایک نہایت اہم شناختی کارڈ تصور کیا جاتا ہے اور یہ دنیا بھر میں اس مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

تاہم دو سو سال پہلے انگلیوں کے نشانات اس قدر اہم نہ تھے کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں یہ بات دریافت ہوئی تھی کہ انسانوں کی انگلیوں کے نشان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں ایک انگریز سائنسدان Henry Faulds نے اپنے ایک مقالے میں جو ''نیچر'' نامی جریدے میں شائع ہوا، اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ لوگوں کی انگلیوں کے نشان عمر بھر تبدیل نہیں ہوتے اور ایسے مشتبہ لوگ جن کی انگلیوں کے نشان کسی شے پر مثلاً شیشے وغیرہ پر رہ

جاتے ہیں ان کی بنیاد پر ان پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ ایسا پہلی بار ۱۸۸۴ء میں ہوا کہ انگلیوں کے نشانات کی شناخت کی بنا پر ایک قتل کے ملزم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس دن سے انگلیوں کے نشانات شناخت کا نہایت عمدہ طریقہ بن گئے ہیں۔ تاہم ۱۹ ویں صدی سے قبل غالباً لوگوں نے بھول کر بھی نہ سوچا ہوگا کہ ان کی انگلیوں کے نشانات کی لہر دار لکیریں بھی کچھ معنی رکھتی تھیں اور ان پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

ساتویں صدی میں قرآن حکیم میں اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ انسانی انگلیوں کے نشانات اہم خاصیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک آیت میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوا:

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ؕ

''کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں''۔ (سورۃ القیمۃ:۴-۳)

انسان کی پیدائش

قرآن حکیم میں ایمان کی دعوت دیتے ہوئے بہت سے متنوع موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کبھی آسمانوں، کبھی جانوروں تو کبھی پودوں کے ذکر سے اللہ نے انسان کو ثبوت فراہم کئے۔ بہت سی قرآنی سورتوں میں لوگوں کو اپنی تخلیق کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔ انہیں اکثر یہ یاد دلایا گیا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی پیدائش کیسے ہوئی وہ کن مراحل سے گزرا اور اس کا اصل جوہر کیا ہے:

نَحۡنُ خَلَقۡنٰکُمۡ فَلَوۡ لَا تُصَدِّقُوۡنَ ؕ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ؕ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ؕ

''ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟'' (سورۃ الواقعہ ۵۹-۵۷)

تخلیق آدم اور اس کے معجزانہ پہلو کو بہت سی قرآنی سورتوں میں منکشف کیا گیا۔ ان سورتوں میں شامل معلومات کے کچھ ٹکڑے اس قدر مفصل ہیں کہ ساتویں صدی میں رہنے والے کسی انسان کے لئے انہیں جاننا ناممکن تھا۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ انسان کو مکمل مادہ منویہ سے تخلیق نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ایک چھوٹے سے حصے سے
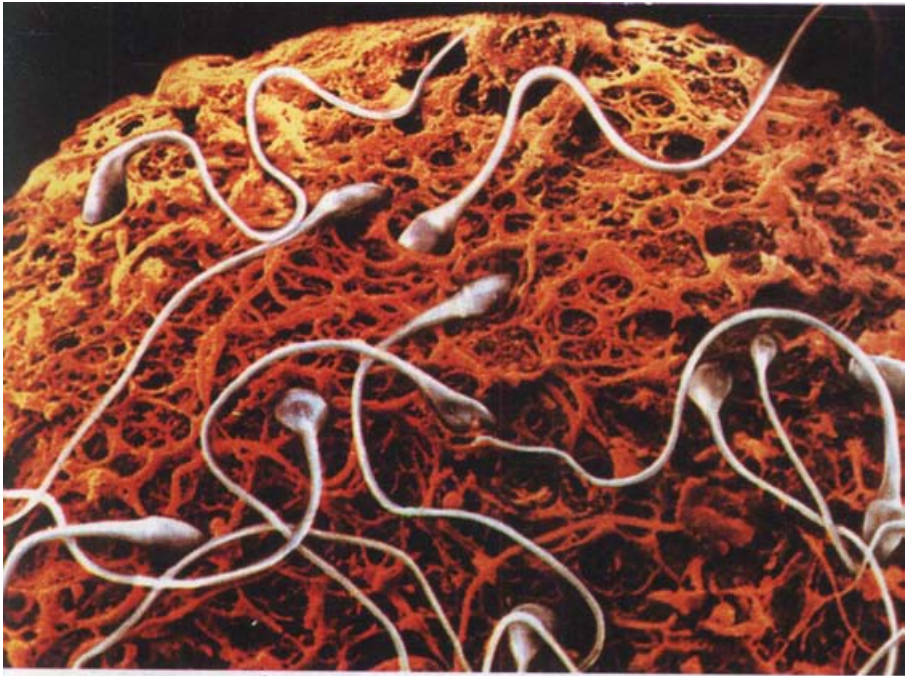
بیضہ کو گھیرے ہوئے کرم منوی۔

(تولیدی خلیہ)

۲۔ نوزائیدہ بچے کی جنس کا فیصلہ نر سے کیا جاتا ہے۔

۳۔ انسانی جنین رحم مادر میں جونک کی مانند چمٹ جاتا ہے۔

۴۔ انسان رحم مادر کے اندر تین تاریک حصوں میں نشوونما پاتا ہے۔

وہ لوگ جو اس عہد میں زندہ تھے جب قرآن نازل ہوا، یقیناً وہ یہ جانتے تھے کہ تولید کے لئے بنیادی مادہ نر کے مادہ منویہ سے متعلق تھا جو جنسی اختلاط یا مباشرت کے وقت خارج ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت کہ بچہ نو ماہ کے عرصے کے بعد پیدا ہوتا ہے، ایک ایسا واقعہ تھا جس میں مزید کسی تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ مگر محولہ بالا معلومات کے جو حصے تحریر میں لائے گئے اس عہد کے انسانوں کی علمی سطح سے بالاتر تھے۔ ان کی دریافت ۲۰ویں صدی کی جدید سائنس کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ آیئے اب ان کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

مادہ منویہ کا قطرہ

مباشرت کے دوران ایک نر بیک وقت ۲۵۰ ملین کرم منوی خارج کرتا ہے۔ یہ تولیدی مادہ

پانچ منٹ کا مشکل سفر ماں کے جسم میں طے کر کے بیضہ تک پہنچتا ہے۔ ۲۵۰ ملین میں سے صرف ایک ہزار کرم منوی بیضے تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس بیضے کا سائز نصف نمک کے دانے کے برابر ہوتا ہے جس میں صرف ایک کرم منوی کو اندر آنے دیا جاتا ہے۔ گویا انسان کا جوہر پورا مادہ منویہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ اس کا جوہر بنتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح آیا ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًیo اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰیo

”کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے“۔ (سورة القیمة: ۳۷-۳۶)

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسان مکمل مادہ منویہ سے نہیں بنایا جاتا بلکہ وہ تو اس کے ایک چھوٹے سے حصے سے بنتا ہے۔ اس بیان میں جس حقیقت کا بطور خاص اعلان کیا گیا اسے جدید سائنس نے بہت دیر بعد دریافت کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیان الٰہیاتی بیان ہے۔

مادہ منویہ میں ایک آمیزہ

وہ سیال مادہ جو مادہ منویہ کہلاتا ہے اس میں صرف کرم تولیدی ہی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس یہ مختلف سیال مادوں کا آمیزہ ہوتا ہے۔ ان سیال مادوں کے اپنے اپنے کام ہوتے ہیں مثلاً کرم تولیدی کو توانائی پہنچانے کے لئے ضروری مقدار میں شکر کی موجودگی، رحم مادر کے مقام دخول پر ترشوں کی تعدیل (Neutralising) اور کرم منوی کی حرکت کو آسان بنانے کے لئے پھسلن والا ماحول بنانا۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ مادہ منویہ کا ذکر جب قرآن میں کیا گیا تو جدید سائنس نے جو دریافت کی ہے اس کا بھی ذکر موجود ہے اور مادہ منویہ کی تشریح ایک سیال آمیزہ کے طور پر بھی کی گئی ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَo خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍo

”پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی“۔ (العلق: ۲-۱)

ایک اور آیت میں مادہ منویہ کو ایک بار پھر آمیزہ کہا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ
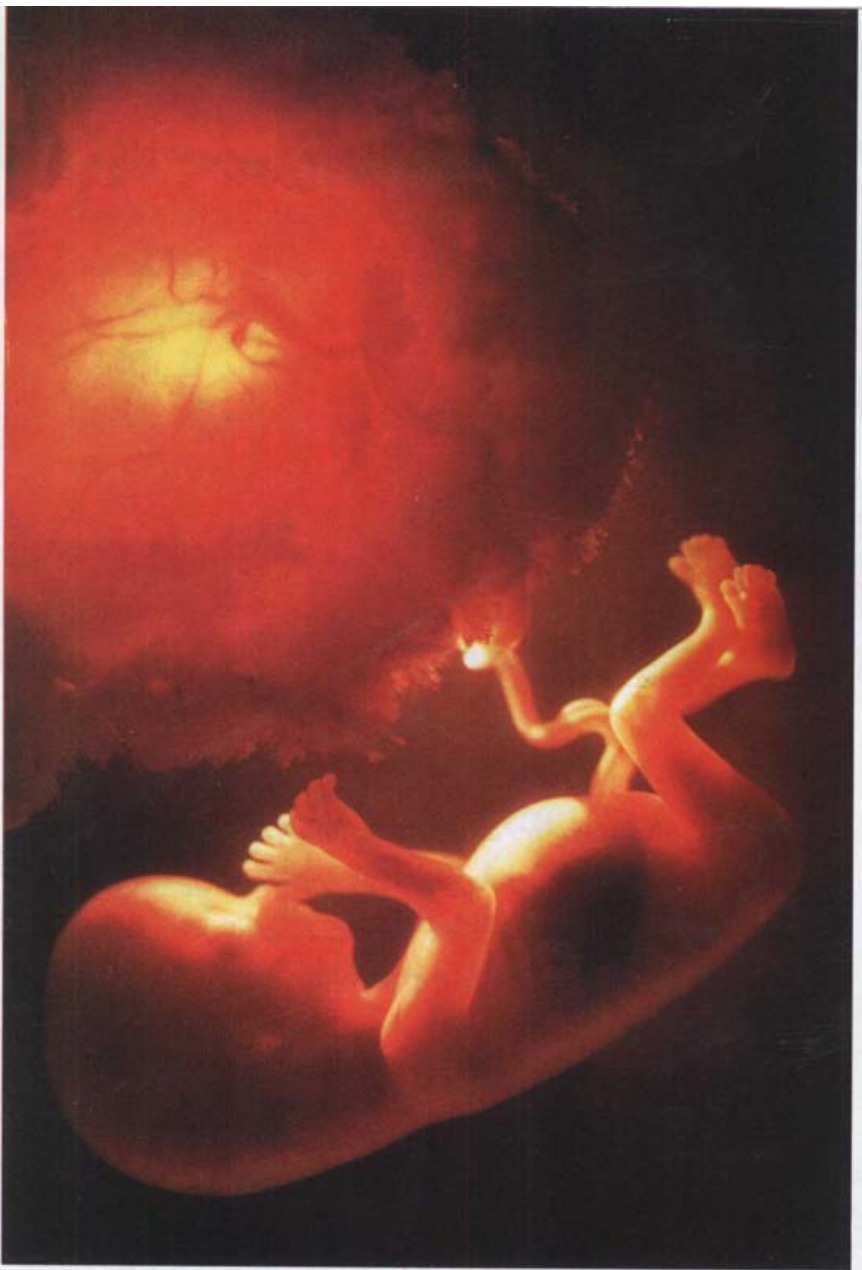
انسان اس آمیزے کے "جوہر" سے تخلیق کیا گیا ہے:

اَلَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ

نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ۝
”جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے ست (جوہر) سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے“ (سورۃ السجدہ: ۸-۷)

عربی زبان میں ”سُلٰلَة“ کا ترجمہ ست یا جوہر کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کسی شے کا نہایت ضروری اور بہترین حصہ۔ اس کا جو بھی مفہوم لیا جائے اس کے معنی ہیں ”کسی کل کا ایک جزو“۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن اس ہستی کا کلام ہے جو انسان کی تخلیق سے متعلق باریک ترین تفصیلات اور جزئیات تک سے آگاہ ہے۔ یہی خالق بنی آدم ہے۔

بچے کی جنس کا تعین

ماضی قریب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بچے کی جنس کا تعین نر اور مادہ دونوں کے جین سے ہوتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں جب جینیات اور خورد حیاتیات کے علوم نے ترقی کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس سارے عمل میں مادہ کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔

46 لونیے (Chromosomes) میں سے صرف دو ایسے ہوتے ہیں جو انسانی جسم کی ساخت کا تعین کرتے ہیں اور یہ جنس کے لونیے ہوتے ہیں۔ انہیں نر میں ”ایکس وائی“ (XY) اور مادہ میں ”ایکس ایکس“ (XX) کہا جاتا ہے، اس لئے کہ ان کی شکل ان حروف سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ لونیہ ”وائی“ وہ ہے جو بطور خاص نر کے تمام جین اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ایک شیر خوار بچے کی شکل وصورت دو لونیوں کے یکجا ہونے سے بننی شروع ہو جاتی ہے ان میں سے ایک لونیہ باپ کا ہوتا ہے اور ایک ماں کا۔

ایکس (X) لونیے، ان کے تولیدی خلیے (ova) اپنے اندر صرف ان کو رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس نر دونوں ایکس اور وائی لونیے رکھتے ہیں چنانچہ ان کے نصف تولیدی خلیے (Sperms) ایکس ہوں گے اور نصف وائی۔ اگر ایک بیضہ کسی ایسے مادہ منویہ سے اتصال کرتا ہے جس میں ایکس لونیے ہوں تو اولاد مادہ پیدا ہوگی اور اگر یہ وائی لونیے والے مادہ منویہ سے اتصال کرتا ہے تو اولاد نر پیدا ہوگی۔

دوسرے لفظوں میں ایک بچے کی جنس کا تعین (ایکس یا وائی) اس وقت ہوتا ہے جب نر

کے لونیے مادہ کے لونیوں سے اتصال کرتے ہیں اس میں سے بیسویں صدی کی جینیاتی دریافت تک، کسی کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ بیشک کئی معاشروں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ماں کی صحت وغیرہ پر انحصار تھا بچے کی جنس کے تعین کا۔ اسی وجہ سے جب بیٹیاں پیدا ہوتیں تو ماؤں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا تھا۔ (یہ قدیم عقیدہ اب بھی عام ہے) تیرہ سو سال قبل جب جین ابھی دریافت نہ ہوئے تھے قرآن نے اس بارے میں جو معلومات مہیا کیں وہ اس کی تردید کرتی تھیں۔

قرآن حکیم کی ایک سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ مادہ منویہ کے ایک قطرے سے بچے یا بچی کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنس کا ماخذ عورت نہیں بلکہ مرد ہوتا ہے۔

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰىo مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰىo

''اور یہ کہ اسی نے زندگی بخشی اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے''۔ (سورۃ النجم:۴۶-۴۵)

رحم مادر سے چمٹ جانے والا خون کا لوتھڑا

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا جب نر کا مادہ منویہ مادہ کے بیضے سے اتصال کرتا ہے تو پیدا ہونے والے بچے کا ''جوہر'' یا ''ست'' متشکل ہوتا ہے اس واحد خلیے کو حیاتیات میں ''جفتہ'' (Zygote) کہتے ہیں، جو تقسیم کے ذریعے عمل تولید شروع کر دیتا ہے اور بالآخر ''گوشت کا لوتھڑا'' بن جاتا ہے تاہم یہ جفتہ اپنی نشو و نما کا عرصہ خالی مقام پر نہیں گزارتا۔ یہ ان جڑوں کی مانند رحم مادر سے چمٹ جاتا ہے، جو زمین کے ساتھ بیل نما تنوں (Tendrils) کے ذریعے پیوست رہتی ہیں۔ اس بندھن کے ذریعے یہ جفتہ ماں کے جسم سے وہ ضروری مادے حاصل کر سکتا ہے جن کی اس کو نشو و نما کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کی تفصیل طب کے علم کے بغیر جاننا ممکن ہی نہ تھا۔ اور یہ بات عیاں ہے کہ ایسی معلومات ۱۴ سو سال قبل کسی بھی انسان کے پاس نہ تھی۔

ایک جفتہ جو ایک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رحم مادر سے چمٹا ہوا ہے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے یہ کہ اللہ نے قرآن حکیم میں جفتے کی نشو و نما کو رحم مادر میں ''خون کا لوتھڑا'' کہا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَo خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍo اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُo

”پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے“۔ (العلق: ۳-۱)

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًىo اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰىo ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰىo فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰىo

”کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔ پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں“۔ (سورۃ القیمۃ: ۳۹-۳۶)

لفظ "Clot" گوشت کے ٹکڑے کے عربی میں معنی ہیں ''کوئی شے جو کسی اور سے چمٹ جائے''۔اس کے لفظی معنی ہیں جونکوں کا ایک جسم کے ساتھ خون چوسنے کے لئے چمٹ جانا۔ جفتے کی تشریح کے لئے اس سے بہتر لفظ اور کوئی نہ تھا، جو رحم مادر سے چمٹ جاتا ہے اور اس میں سے اس کے مادے جذب کر لیتا ہے؛ قرآن میں جفتے کی تشریح کے لئے زیادہ باتیں منکشف کرنے کے لئے موجود ہیں۔

رحم مادر سے پوری طرح چمٹ جانے کے بعد یہ جفتہ بالیدہ ہونے لگتا ہے اس دوران رحم مادر ایک سیال مادے سے بھر جاتا ہے جسے ''غلاف جنین سیال مادہ'' کہتے ہیں جو جفتے کو گھیر لیتا ہے۔اس سیال مادے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچے کی نشوونما ہوتی ہے اور یہ باہر کی ہر ضرب یا چوٹ سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔قرآن حکیم میں اس حقیقت کو یوں منکشف کیا گیا ہے:

اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍo فَجَعَلۡنٰهُ فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍo

''کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھہرائے رکھا''۔(سورۃ المرسلٰت ۲۱-۲۰)

انسان کے متشکل ہونے کے بارے میں قرآن میں دی گئی یہ ساری معلومات اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ صحیفہ آسمانی کسی ایسے منبع اور سرچشمہ سے آیا ہے جو اس کی شکل وصورت کے بننے کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک سے بھی واقف ہے۔

یہ صورت حال ایک بار پھر ثابت کرتی ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے۔ یہ بالکل ہی جاہلانہ بات ہوگی اگر کوئی یہ کہنے پر مصر ہو کہ قرآن میں دی گئی ساری معلومات جو انسان کی پیدائش سے متعلق ہے اس کا درست ہونا ''حسن اتفاق یا کسی انطباق'' کا نتیجہ ہے۔قرآن میں چونکہ بہت سی تفصیل دے دی گئی ہے اور اس قسم کی تفصیلات کی لئے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سچائی اور حقیقت کے ساتھ محض اتفاقاً مطابقت رکھتی ہوں۔

قرآن میں دی گئی ہر بات سچ ہے اس لئے کہ ہر قرآنی آیت اللہ کے کلام پر مشتمل ہے۔ چونکہ اللہ نے انسان کو رحم مادر میں ایک شکل وصورت دے کر تخلیق کیا اس لئے اس سارے تخلیقی عمل کے بارے میں بتائے گئے بہترین الفاظ بھی اسی کے ہیں۔اللہ، جس نے ہم سب کو اسی طریقے سے تخلیق کیا ہماری پیدائش اور آغاز زندگی کے بارے میں ایک اور سورۃ میں اس طرح ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍo ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍo ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَo

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیو ں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر''۔ (سورۃ المومنون: ۱۲-۱۴)

کتاب دوئم

وہ لوگ جو تخلیق کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے

اِرتقاء ایک فریب

نظریۂ اِرتقاء ایک فلسفہ اور دنیا کا ایک ایسا نظریہ ہے جو غلط اور نادرست اعلانات، قیاسات اور تصوّراتی منظرنامے پیش کرتا ہے تاکہ زندگی کے آغاز اور اس کی موجودگی کو محض اتفاقات کا نتیجہ ثابت کرسکے۔ اس فلسفے کی جڑیں عہد عتیق اور قدیم یونان تک جا پہنچتی ہیں۔

تمام ملحدانہ فلسفے جو تخلیق سے انکار کرتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ نظریۂ اِرتقاء کا دفاع کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال کا اطلاق آج ان تمام نظریات، اور نظاموں پر ہوتا ہے جو مذہب سے مخاصمت رکھتے ہیں۔

اِرتقائی تصوّر کو پچھلی ڈیڑھ صدی سے سائنسی بہروپ دے دیا گیا ہے تاکہ اسے صحیح ثابت کیا جاسکے۔ اسے حالانکہ ۱۹ویں صدی کے وسط میں ایک سائنسی نظریے کے طور پر پیش کیا گیا مگر پھر بھی اس نظریے کو اس کی وکالت کرنے والوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود، کسی سائنسی دریافت یا تجربے سے اب تک صحیح ثابت نہیں کیا جاسکا۔ بیشک ''خود سائنس'' جس پر یہ نظریہ اس قدر انحصار کرتا ہے مسلسل یہ بات پیش کررہی ہے کہ درحقیقت اس نظریے میں اہلیت کی بنیاد پر زندہ رہنے کے لئے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔

تجربہ گاہوں کے تجربات اور امکانی تخمینوں نے یہ واضح کردیا ہے کہ وہ امینو ترشے جن سے زندگی جنم لیتی ہے اتفاق سے وجود میں نہیں آسکتے تھے۔ اِرتقاء پسندوں کے دعوے کے مطابق وہ خلیہ جو قدیم اور غیر منضبط زمینی حالات کے تحت وجود میں آیا تھا، بیسویں صدی کی جدید ترین تجربہ گاہوں کے اعلیٰ تکنیکی آلات کے ذریعے بھی اس کی ترکیب و تالیف ممکن نہیں ہے۔

نو ڈاروِنی نظریے کے دعووں کی روشنی میں کوئی واحد جاندار بھی دنیا میں کسی جگہ فوسل

ریکارڈ کی طویل تحقیق کے باوجود تلاش نہیں کیا جاسکا جس سے وہ ''عبوری شکل'' سامنے آتی جس میں ان کے خیال میں بتدریج اِرتقاء ہوا تھا۔

اِرتقاء کے ثبوت جمع کرنے کی خاطر اِرتقاء پسندوں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی طرح اسے ثابت کرسکیں مگر اس کے برعکس خود وہ اپنے ہاتھوں یہ ثبوت مہیا کرنے لگے ہیں کہ ارتقاء سرے سے ہوا ہی نہیں ہے!

وہ شخص جس نے بنیادی طور پر نظریۂ اِرتقاء پیش کیا اس کا نام چارلس رابرٹ ڈارون تھا جو ایک انگریز غیر پیشہ ور ماہر حیاتیات تھا، اس نے سب سے پہلے اپنے خیالات کو جس کتاب میں پیش کیا، وہ کتاب ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی، نام تھا ''نوع کی ابتداء، بذریعہ فطری انتخاب'' (The Origin of Species by means of Natural Selection) ڈارون نے اپنی کتاب میں یہ دعویٰ پیش کیا کہ تمام جانداروں کا جدامجد ایک ہے اور یہ سب کے سب فطری انتخاب کے ذریعے بذریعہ اِرتقائی عمل وجود میں آئے تھے۔ وہ جاندار جو اپنے مسکن کے مطابق ڈھل گئے تھے انہوں نے اپنی صفات اپنے بعد آنے والی نسلوں میں منتقل کردی تھیں۔ پھر ایک طویل عرصے تک جمع ہو جانے کے بعد ان مفید صفات نے ایک واحد شے کو اپنے اجداد سے بالکل مختلف نوع (Species) میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس فطری انتخاب کے میکانکی عمل کی بہترین پیداوار انسان تھا۔ مختصر یہ کہ ایک نوع کی ابتداء ایک دوسری نوع سے ہوئی تھی۔

ڈارون کے تخیلاتی نظریات کو ہاتھ میں لے کر انہیں مزید فروغ دینے کے لئے کئی نظریاتی اور سیاسی حلقے سرگرم عمل ہوگئے تھے اور یوں یہ نظریہ بہت مقبول ہوا۔ اس مقبولیت کے پس پردہ ایک بڑی حقیقت یہ کارفرما تھی کہ اس دور میں ابھی علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ڈارون کے تصوراتی منظر نامے کو غلط اور نادرست ثابت کیا جاسکتا۔ جس وقت ڈارون نے اپنے مفروضات پیش کئے اس وقت جینیات، خورد حیاتیات اور حیاتیاتی کیمیا کا وجود ہی نہ تھا۔ اگر یہ علوم موجود ہوتے تو ڈارون نے بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات تسلیم کرلی ہوتی کہ اس کا نظریہ مکمل طور پر غیر سائنسی تھا اور یوں وہ اس طرح کے لغو اور بے معنی دعوے کرنے سے باز آ گیا ہوتا:-

کہ وہ معلومات جو نوع کا تعین کرتی ہے پہلے سے جین میں موجود ہوتی ہے اور فطری انتخاب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ جین تبدیل کرکے نئی نوع پیدا کرسکے۔

ابھی ڈارون کی کتاب کی بازگشت سنائی دے رہی تھی کہ ایک آسٹریائی ماہر نباتات گریگر

مینڈل(Gregor Mendol) نے ۱۸۶۵ء میں موروشیت کے قوانین دریافت کر لئے تھے۔ صدی کے آخر تک اس بارے میں زیادہ کچھ سننے میں نہ آیا تھا لیکن ۱۹ویں صدی کے آغاز میں جینیات کی سائنس کی پیدائش کے ساتھ ہی مینڈل کی دریافت کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ پھر کچھ عرصے بعد جین اور لونیوں کی ساخت دریافت ہوگئی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں ڈی این اے سالمے کی دریافت نے جو جینیاتی معلومات تشکیل دیتی ہے نظریۂ ارتقاء کو ایک بہت بڑے بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ڈی این اے میں پائی جانے والی بے پناہ معلومات کے ماخذ کو اتفاقیہ طور پر پیش آنے والے واقعات سے واضح کرنا ممکن نہ تھا۔

اس تمام سائنسی ترقی کے باوجود کوئی بھی عبوری شکلیں، جن سے جاندار نامیوں کو قدیم نوع سے ترقی یافتہ نوع میں بتدریج ارتقاء سے پہنچنا تھا، برسوں کی تحقیق کے باوجود تلاش نہیں کی جا سکی تھیں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ اس ساری ترقی نے ڈارون کے نظریے کو منسوخ کر کے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا ہوتا۔ تاہم ایسا اس لئے نہ ہوا کیونکہ کچھ حلقے ایسے تھے جو اس نظریے پر نظرِ ثانی، اس کی تجدید اور اسے بلند کر کے سائنسی پلیٹ فارم پر لے آنے پر زور دے رہے تھے۔ یہ ساری کوششیں اس وقت بے معنی ہو جاتی ہیں جب ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ اس نظریے کے پس پردہ نظریاتی ادارے موجود تھے سائنسی فکرمندی نہیں۔ اس کے باوجود کچھ حلقے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک ایسا نظریہ جو ایک بند گلی میں پہنچ چکا تھا اسے سہارا دینے کے لئے ایک نیا ماڈل تشکیل دیا جائے۔ اس نئے ماڈل کا نام نوڈارونیت تھا۔ اس نظریے کے مطابق وہ نوع جو عمل تغیر کے نتیجے میں بنتی ہیں جن میں معمولی سی جینیاتی تبدیلیاں آجاتی ہیں، ان میں سے وہ جو زندہ رہنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوں گی وہ فطری انتخاب کے میکانکی عمل کے ذریعے زندہ رہ جائیں گی۔ تاہم جب یہ ثابت ہو گیا کہ نوڈارونیت نے جو میکانکی عمل تجویز کئے تھے وہ قابل عمل نہ تھے اور جانداروں کے متشکل ہونے کیلئے معمولی تبدیلیاں کافی نہ تھیں، تو ارتقاء پسندوں نے نئے نمونوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ ایک نیا دعویٰ لے کر آئے جسے ''تاکیدی توازن'' (Punctuated Equilibrium) کا نام دیا گیا، جس کی بنیاد کسی معقول ثبوت یا سائنسی بنیادوں پر نہیں رکھی گئی تھی۔ اس ماڈل نے یہ نقطہ نظر دیا کہ جاندار اچانک عبوری شکلوں کے بغیر کسی دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسی نوع جن کے ارتقائی

''مورث اعلیٰ'' نہیں ہوتے وہ اچانک نمودار ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ تخلیق کی وضاحت کا ایک طریقہ تھا حالانکہ اِرتقاء پسند اسے تسلیم کرنے میں تذبذب سے کام لے رہے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کو تحفظ دینے کے لئے نا قابل فہم منظر ناموں کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ پہلا پرندہ تاریخ میں اچانک ایک رینگنے والے چھپکلی یا مگر مچھ نما جانور کے انڈے سے اچانک پھدک کر اس طرح نکل آیا ہوگا۔ کہ اس بات کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ اسی نظریے کے مطابق خشکی پر رہنے والے گوشت خور جانور قوی ہیکل مچھلیوں میں تبدیل ہو گئے ہوں گے اور ان میں ایک اچانک اور قابل فہم قلب ماہیت ہوئی ہوگی۔

یہ ایسے دعوے ہیں جو جینیات، حیاتیاتی طبیعات اور حیاتیاتی کیمیا کے تمام اصولوں کی تردید کرتے ہیں۔ یہ اسی قدر سائنسی ہیں جس قدر وہ پریوں کی کہانیاں ہوتی ہیں جن میں مینڈک شہزادوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تاہم نو ڈارونی دعویٰ جس بحران کا شکار تھا اس سے مایوس ہو کر کچھ اِرتقاء پسند ماہرین قدیم حیاتیات نے اس نظریے کو گلے لگا لیا تھا جو خود نو ڈارونیت سے کہیں زیادہ عجیب وغریب اور اوٹ پٹانگ تھا۔

اس ماڈل کا ایک مقصد تھا کہ فوسل ریکارڈ میں جو گمشدہ کڑیاں تھیں انکے لئے وضاحت پیش کی جائے، جس کی وضاحت نو ڈارونی ماڈل نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم یہ کوئی معقول بات تو نہیں لگتی کہ پرندوں کے اِرتقاء کو اس دعوے کے ذریعے پیش کیا جائے کہ ''ایک پرندہ اچانک چھپکلی نما جانور کے انڈے سے پھدک کر باہر آ گیا تھا'' اور یوں فوسل ریکارڈ میں پائی جانے والی گمشدہ کڑیوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اِرتقاء پسندوں کے اپنے اعتراف کے مطابق ایک نوع سے دوسری نوع میں اِرتقاء کے لئے جینیاتی معلومات میں ایک بڑی اور مفید تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم کسی قسم کا عمل تغیر جینیاتی معلومات کو تبدیل نہیں کرتا نہ ہی اس میں نئی معلومات کا اضافہ کرتا ہے۔ عمل تغیر تو جنیاتی معلومات کو پراگندہ کر دیتا ہے پس ایسے عظیم عمل تغیر بن کا تصور تاکیدی توازنی ماڈل کرتے ہیں جینیاتی معلومات میں صرف ''بڑی'' یا ''عظیم'' تخفیفات اور نقائص پیدا کرتے ہیں۔

نظریۂ تاکیدی توازن محض تخیل کی پیداوار تھا۔ اس عیاں سچائی کے باوجود اِرتقاء کے حامی اس نظریے کی تعریف کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈارون نے جو اِرتقاء کا ماڈل تجویز کیا تھا اسے فوسل ریکارڈ ثابت نہ کر سکا اور انہیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ ڈارون نے دعویٰ کیا تھا

کہ نوع ایک بتدریج اِرتقاء سے گزری تھیں جس نے نصف پرندے اور نصف چھپکلی نما جانور یا نصف مچھلی نصف چھپکلی نما جانور کے اعجوبے کو لازمی بنا دیا تھا۔ تاہم ان میں سے کوئی ایک بھی ''عبوری شکل'' اِرتقاء پسندوں کو وسیع تحقیقی مطالعہ اور ہزاروں فوسلز کو کھود کر نکالنے کے باوجود دستیاب نہ ہوسکی۔

اِرتقاء پسندوں نے تاکیدی توازن کے ماڈل پر اس امید کے ساتھ ہاتھ رکھے کہ وہ اس طرح ایک بڑے فوسل سے ملنے والی ذلت آمیز شکست کو چھپا سکیں گے۔ جیسا کہ ہم پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ بات بالکل عیاں تھی کہ یہ نظریہ ایک واہمہ تھا۔ اور اسی لئے یہ جلد اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ تاکیدی توازن کے ماڈل کو ایک مستقل ماڈل کے طور پر کبھی پیش نہ کیا گیا تھا بلکہ اسے ان حالات میں بطور ایک جائے فرار کے استعمال کیا گیا تھا جو بتدریج اِرتقاء کے ماڈل سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھے۔ چونکہ آج اِرتقاء پسندوں کو اس بات کا احساس ہے کہ پیچیدہ و مکمل اعضاء مثلاً آنکھیں، پنکھ، پھیپھڑے، دماغ وغیرہ بتدریج اِرتقاء کے ماڈل کی صاف صاف تردید کرتے ہیں اس لئے ان مخصوص مقامات پر وہ تاکیدی توازن کے ماڈل کی مضحکہ خیز تشریحات میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

کیا کوئی فوسل ریکارڈ ہے جو نظریۂ اِرتقاء کی تصدیق کر سکے؟

نظریۂ اِرتقاء یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ ایک نوع سے دوسری نوع میں اِرتقاء بتدریج اور مرحلہ وار ہوتا ہے جس میں کئی ملین برس لگتے ہیں۔ یہ منطقی دخل اندازی جو اس قسم کے دعوے سے اخذ کی جاتی ہے اس بات کو لازمی قرار دیتی ہے کہ ایسے جسیم زندہ نامیے جنہیں ''عبوری شکلیں'' کہا جاتا ہے، ان کو اس ماہیت قلبی کے دوران ضرور زندہ رہنا چاہئے تھا۔ چونکہ اِرتقاء پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام جاندار مرحلہ وار عمل تغیر سے ایک شکل سے دوسری شکل میں آئے اس لئے ان عبوری شکلوں کی تعداد اور قسمیں کئی ملین ہونی چاہئیں تھیں۔ اگر یہ مخلوق کبھی زندہ تھی تو پھر ہم کہیں نہ کہیں ان کی باقیات ضرور دیکھیں گے۔ دراصل اگر یہ مفروضہ صحیح ہوتو پھر تو آج جتنے جانور زندہ ہیں ان کی عبوری شکلوں کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ اور دنیا بھر میں ان کے فوسلز کی باقیات بھی بکثرت ملنی چاہئیں تھیں۔

ڈارون کے زمانے سے اِرتقاء پسند فوسلز کی تلاش میں ہیں مگر نتیجہ بری طرح مایوسی و

ناامیدی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ کوئی سے بھی دو نوع کے درمیان کی عبوری شکلیں دنیا کے بحروبر میں کہیں بھی نہیں مل سکیں۔

ڈارون خود بھی اس قسم کی عبوری شکلوں کی عدم موجودگی سے خوب واقف تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ مستقبل میں وہ ضرور تلاش کر لئے جائیں گے۔ امید وتوقع کے باوجود اس نے دیکھا کہ اس کے نظریے میں سب سے بڑا سنگ راہ عبوری شکلوں کی گمشدگی تھی۔ اسی لئے اس نے اپنی کتاب ''نوع کی ابتداء'' (The Origin of Species) میں لکھا:

اگر ایک نوع سے دوسری نوع میں بتدریج منتقلی ہوئی ہے تو پھر ہمیں ہر کہیں عبوری شکلیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ نوع کے بجائے فطرت ابتر اور منتشر کیوں نہیں ہے ہم تو اسے واضح اور صراحت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

اس نظریۂ اِرتقاء کے مطابق تو لاتعداد عبوری شکلیں کرۂ ارض پر موجود ہونی چاہئیں تھیں مگر وہ ہمیں کیوں نہیں ملتیں؟...... درمیانی خطے میں، جہاں زندگی درمیانی حالت میں ملتی ہے، ہم بہت مربوط قسمیں کیوں نہیں پاتے؟ اس مشکل نے طویل عرصے تک مجھے بے حد پریشان رکھا!

ڈارون کو بھی بجا طور پر ضرور پریشان ہونا چاہئے تھا۔ اس مسئلے نے دوسرے اِرتقاء پسندوں کو بھی پریشان رکھا۔ ایک برطانوی مشہور ماہر قدیم حیاتیات Derek V.Ager اس الجھا دینے والی حقیقت کا اعتراف یوں کرتا ہے:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم تمام فوسل ریکارڈ کا تفصیلی جائزہ لیں خواہ یہ درجہ وترتیب کی سطح تک ہو یا انواع کی سطح تک، ہمیں کہیں بھی بتدریج اِرتقاء نظر نہیں آتا بلکہ ایک گروہ کا دوسرے گروہ کی بنیاد پر اچانک دھماکہ خیز انداز میں سامنے آنا دکھائی دیتا ہے۔

فوسل ریکارڈ کی گمشدہ کڑیوں کی اس حسرت زدہ خیال کے ساتھ وضاحت نہیں کی جا سکی کہ فوسلز ابھی تک زیادہ دریافت نہیں ہو سکے اور ایک دن یہ ضرور تلاش کر لئے جائیں گے۔ ایک اور اِرتقاء پسند ماہر قدیم حیاتیات T.Neville George اس کا سبب یہ بیان کرتا ہے:

فوسل ریکارڈ کی کمی کے لئے اب مزید معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کئی لحاظ سے یہ کافی حد تک موجود ہے اور مزید جو دریافتیں ہو رہی ہیں ان سے یہ تکمیل کی رفتار سے بڑھ گیا ہے تاہم فوسل ریکارڈ زیادہ تر درمیانی گمشدہ کڑیوں سے مل کر بننے کے تسلسل سے گزر رہا ہے۔

بائیں: لال بیگ کا ۳۲۰ ملین برس پرانا فوسل۔
نیچے: سہ لختہ دار بحری جانور کا ۳۶۰ ملین برس پرانا فوسل

زندگی کرۂ ارض پر اچانک اور جامع و مکمل شکل میں نمودار ہوئی

جب قدیم کرۂ ارض کے پرتوں اور فوسل ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جاندار نامیاتی جسم بھی ان کے ساتھ ساتھ وجود میں آئے تھے۔ زمین کا قدیم ترین پرت جس میں جاندار مخلوق کے فوسلز ملے ہیں وہ ''کیمبری'' (Cambrian) ہیں جن کی عمر تخمیناً ۵۲۰-۵۳۰ ملین برس ہے۔

وہ جاندار جو زمین کے کیمبری عہد میں پائے گئے فوسل ریکارڈ میں اچانک شامل ہو گئے تھے اور ان کے کوئی آباؤ اجداد اس سے قبل موجود نہ تھے۔ جاندار نامیوں کے وسیع نقوش جو اتنے لاتعداد، جامع و مکمل مخلوق سے بنے تھے اس قدر اچانک پیدا ہوئے کہ اس حیرت انگیز عہد کو سائنسی ادب میں ''کیمبری دھاکہ'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

زمین کے اس پرت میں پائے جانے والے نامیے بے حد ترقی یافتہ اعضاء تھے مثلاً آنکھیں ، یا وہ نظام جو ان نامیاتی اجسام میں نہایت ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے تھے جیسے گلپھڑے اور دورانِ خون کے نظام وغیرہ۔ اس فوسل ریکارڈ میں کوئی بھی ایسی علامت نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ان نامیوں کے کوئی آباؤ اجداد بھی تھے۔

اِرتقاء کے نہایت اہم ثبوت جو مسترد کر دیئے گئے

(نیچے) Coelacanth مچھلی کے ۴۱۰ ملین برس پرانے فوسل اِرتقاء پسندوں کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ایک ایسی درمیانی شکل تھی جو ثابت کرتی تھی کہ یہ مچھلی پانی سے خشکی پر کس طرح منتقل ہوئی۔ یہ حقیقت کہ اس مچھلی کی ۴۰ سے زیادہ زندہ مثالیں موجود ہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران اسے کئی بار پکڑا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسی مکمل مچھلی ہے جو آج بھی زندہ ہے۔(بائیں) ۱۳۵ ملین برس پرانا فوسل جو ARCHAEOPTERYX کا تھا جسے پرندوں کا جدامجد بتایا گیا اور جس کے متعلق کہا گیا کہ یہ ڈائنوساروں سے بذریعہ عمل تغیر وجود میں آیا تھا۔ اس فوسل پر کی گئی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ ایک ناپید پرندہ ہے جو بھی اُڑتا تھا۔

Richard Monestarsky جو ''اَرتھ سائنسز'' (Earth Sciences) رسالے کا مدیر تھا جانداروں کے اچانک پیدا ہونے کے بارے میں لکھتا ہے:

نصف بلین برس قبل جانوروں کے قابل ذکر حد تک مکمل اجسام، جو آج ہمیں نظر آتے ہیں، اچانک نمودار ہوئے تھے۔ یہ لمحہ ارضی کیمبری عہد کے آغاز میں تقریباً ۵۵۰ ملین برس قبل اس اِرتقائی دھماکے کی نشاندہی کرتا ہے جس نے سمندروں کو دنیا کے اوّلین مکمل جانداروں سے بھر دیا تھا۔

آج کے بڑے بڑے جانور کیمبری عہد کے آغاز میں موجود تھے اور آج کی طرح اس زمانے میں بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

اِرتقاء پسند جب اس سوال کا جواب نہ دے سکے کہ کرۂ ارض کس طرح جانوروں کی ہزاروں نوع سے بھر گیا تھا تو انہوں نے ایک ایسے تصوّراتی عہد میں پناہ ڈھونڈی جو کیمبری عہد سے بیس ملین برس قبل کا تھا تا کہ وہ یہ بتا سکیں کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی اور ''نامعلوم کیسے وقوع پذیر ہوا''۔ اس عہد کو ''اِرتقائی خلاء تا گمشدہ کڑی'' کا نام دیا گیا۔ اس کے لئے کبھی بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا اور یہ نظریہ اب بھی غیر واضح ہے جس کی کوئی تشریح نہیں کی جا سکی۔

۱۹۸۴ء میں لاتعداد مکمل ریڑھ دار جانوروں کی باقیات کو جنوب مغربی چین کے مرکزی Yunnan کے پہاڑی علاقے Chengjiang کی زمین کھود کر نکالا گیا تھا۔ان میں سہ لختہ دار بحری جانور (Trilobites۔حجری دور کے بحری جانور۔ان کے جسم بیضوی شکل کے چپٹے ہوتے تھے اور لمبائی ایک انچ سے دو فٹ تک) شامل تھے جو اب اس دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں مگر یہ جدید ریڑھ دار جانوروں کی نسبت کسی طرح بھی کم جامع و مکمل شکل میں نہیں تھے۔

ایک سویڈنی ارتقاء پسند اور ماہر قدیم حیاتیات اس صورت حال کے بارے میں یوں وضاحت کرتا ہے:

اگر تاریخ حیاتِ انسانی کا کوئی واقعہ انسان کی تخلیق کی داستاں سے ملتا جلتا ہے تو وہ یہی سمندری زندگی کے اچانک متنوع صورت میں نمودار ہونے کا واقعہ ہے جب ماحولیات اور اِرتقاء میں بین الخلیاتی نامیاتی اجسام نے اپنی بالادستی سمیت مخصوص کارندوں کے طور پر نظام سنبھال لیا تھا۔ڈارون کے لئے یہ بات بڑی حیران کن (اور پریشان کن) تھی اور یہ واقعہ اب بھی ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

ارتقاء پسندوں کے لئے آج ان مکمل جانداروں کا نمودار ہونا جن کے آباؤ اجداد کوئی نہ تھے کوئی کم حیرت انگیز نہیں ہے (اور پریشان کن بھی) جتنا کہ ۱۳۵ برس قبل تھا۔تقریباً ڈیڑھ سو سال میں وہ اس مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے جس نے ڈارون کو نا قابل حل پریشانی سے دوچار کیا تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ فوسل ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ جاندار قدیم سے جدید شکلوں میں تبدیل نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ تو اچانک اور مکمل شکل میں پیدا ہوئے عبوری یا درمیانی شکلوں کی عدم موجودگی صرف کیمبری عہد کے ساتھ ہی وابستہ نہیں ہے۔کوئی ایک بھی تو عبوری شکل ریڑھ دار جانوروں، مچھلیوں، جل تھلیاؤں، چھپکلی نما جانوروں، پرندوں، دودھ پلانے جانوروں، کی آج تک نہیں ملی۔ ہر جاندار نوع فوسل ریکارڈ میں جامع و مکمل شکل میں اور اچانک نمودار ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جاندار بذریعہ ارتقاء وجود میں نہیں آئے تھے بلکہ انہیں تخلیق کیا گیا تھا۔

نظریۂ اِرتقاء کی فریب کاریاں-تصاویر میں دھوکہ و فریب

وہ لوگ جو نظریۂ اِرتقاء کے لئے ثبوت ڈھونڈتے ہیں ان کے لئے فوسل ریکارڈ ایک بڑا

ں اور دوسری مطبوعات میں اس قدر مہارت سے نصف انسان اور نصف
ں مسلسل بنائی ہوئی تصاویر کو دیکھ کر لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ انسان عمل تغیر
ند بندر یا اس جیسے کسی جانور کی شکل سے موجودہ صورت میں آیا مگر یہ ساری
ر جعلسازی اور دھوکہ وفریب کی پیداوار ہیں۔
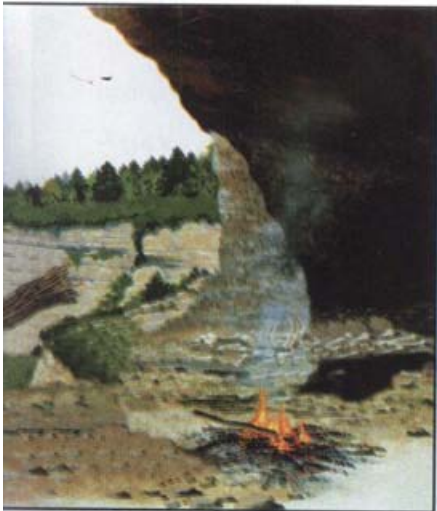
ماخذ ہے۔ اگر احتیاط کے ساتھ اور بلا تعصب اس کا معائنہ کیا جائے تو بجائے تصدیق کرنے کے فوسل ریکارڈ نظریۂ ارتقاء کی تردید کرتا ہے۔ تاہم ارتقاء پسندوں نے فوسلز کی گمراہ کن تشریحات پیش کر کے اور لوگوں کے سامنے موضوعی انداز میں ان کی نمائندگی سے یہ تاثر دیا ہے کہ فوسل ریکارڈ نظریۂ ارتقاء کی حمایت کرتا ہے۔ فوسل ریکارڈ میں چند دریافتوں کی تمام قسم کی تشریحات اثر پذیری ہی وہ شے ہے جو ارتقاء پسندوں کے مقصد کو بہترین طور پر پورا کرتی ہے۔ وہ فوسلز جن کو زمین کھود کر نکالا گیا ہے وہ زیادہ تر تو قابل اعتماد شناخت کے لئے غیر تسلی بخش ثابت ہوئے ہیں۔ وہ عموماً ہڈیوں کے بکھرے ہوئے نامکمل ٹکڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے دستیاب اعداد و شمار میں جعلسازی کے ذریعے ردوبدل بہت آسان ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسے حسب منشاء استعمال کر سکتے ہیں۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جو تصاویر اور خاکے ارتقاء پسند از سرنو بناتے ہیں وہ ان فوسلز کی باقیات پر مبنی ہوتے ہیں جن کو وہ محض تخیلات کی مدد سے تیار کرتے ہیں تاکہ اپنے ارتقائی دعووں کی تصدیق کر سکیں۔ لوگ چونکہ بصری معلومات سے باآسانی متاثر ہو جاتے ہیں اس لئے یہ نوساختہ نمونے انہیں متاثر کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ جس مخلوق کے یہ ماڈل ہیں وہ ماضی میں زندہ تھی۔

ارتقاء پسند محققین تصوراتی مخلوق کی تصاویر اور خاکے بناتے وقت عموماً ایک دانت یا جبڑے

کے ٹکڑے یا بازو کی ہڈی سے مدد لیتے ہیں اور انہیں ایسے سنسنی خیز انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جیسے وہ انسانی اِرتقاء کی ایک کڑی ہوں۔ ان تصاویر نے ''قدیم انسانوں'' کی شبیہ کو بہت سے انسانوں کے ذہنوں میں پختہ کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

یہ مطالعاتی جائزے جن کی بنیاد ہڈیوں کی باقیات ہوتی ہے دستیاب شے کی بہت عام قسم کی خصوصیات ظاہر کرتی ہیں۔ اصل نمایاں جزئیات نرم ریشوں میں موجود ہوتی ہیں جو بہت جلد غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ نرم ریشے جن کی تشریح محض تخیلات کی مدد سے کی جاتی ہے اس سے تخیلات کی حدود کے اندر اندر ہر شے ممکن نظر آتی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا Earnest A.Hooten اس صورت حال پر یوں اظہار خیال کرتا ہے:

نرم اعضاء کو بحال کرنے کی کوشش اور زیادہ پر خطر کام ہے۔ ہونٹ، آنکھیں، کان، ناک کا سرا ہڈیوں والے اعضاء پر کوئی نشانات نہیں چھوڑتے۔ آپ یکساں سہولت کے ساتھ ایک Neanderthaloid (انسان سے مشابہ ایک مخلوق) کی کھوپڑی پر کسی (چمپانیز) افریقی لنگور کے خدوخال یا کسی فلسفی کا حلیہ بنا سکتے ہیں۔ قدیم انسان کی قسموں کی بہت کم سائنسی قدر و قیمت ہے اور ان سے لوگوں کو گمراہ کیا جا سکتا ہے...... پس اس تعمیر نو پر یقین نہ کیجئے۔

جعلی فوسلز کی تصوراتی تصاویر

جب اِرتقاء پسندوں کو نظریۂ اِرتقاء کے لئے فوسل ریکارڈ میں قابل تسلیم ثبوت نہ ملا تو انہوں نے اپنے پاس سے اسے گھڑ لینے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کو انسائیکلوپیڈیاؤں میں ''نظریۂ اِرتقاء کی فریب کاریاں'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے جس سے اس بات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ نظریۂ اِرتقاء ایک ایسا نظریاتی اور فلسفیانہ معاملہ ہے جس کا دفاع کرنے میں وہ ناکام رہے ہیں۔ اس دھوکہ وفریب میں سب سے بڑے اور بدنام زمانہ فریب دو ہیں جن کا ذکر نیچے کیا جا رہا ہے۔

پلٹ ڈاؤن آدمی ((Piltdown Man))

چارلس ڈاسن، ایک نامور ڈاکٹر اور غیر پیشہ ور ماہر قدیم حیاتیات، اس دعوے کے ساتھ سامنے آیا کہ اسے ایک جبڑے کی ہڈی اور ایک کھوپڑی کا ٹکڑا پلٹ ڈاؤن، برطانیہ سے (۱۹۱۲ء)

ملا ہے۔ یہ کھوپڑی انسانی نظر آتی تھی مگر جبڑا صاف طور پر بندر کا دکھائی دیتا تھا۔ ان نمونوں کو ''پلٹ ڈاؤن آدمی'' کا نام دیا گیا۔ یہ ۵۰۰ ہزار برس پرانے بتائے جاتے تھے اور انہیں انسانی اِرتقاء کے واضح ثبوتوں کے طور پر دکھایا گیا تھا۔ چالیس سے زائد برسوں تک ''پلٹ ڈاؤن آدمی'' پر سائنسی مضامین لکھے جاتے رہے، بہت سی تشریحات کی گئیں اور بہت سی تصاویر بنائی گئیں۔ اور اس فوسل کو انسانی اِرتقاء کے ایک قطعی ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۴۹ء میں سائنسدانوں نے ایک بار پھر اس فوسل کا معائنہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ فوسل دانستہ طور پر بذریعہ جعلسازی بنایا گیا تھا جس میں کھوپڑی انسانی تھی اور جبڑا ایک انسان نما بندر (Orang-utan) کا تھا۔ فلورین کے ذریعے عرصہ و مدت معلوم کرنے کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے محققین نے دریافت کیا کہ یہ کھوپڑی تو چند ہزار برس پرانی تھی۔ جبڑے میں جو دانت تھے وہ ایک انسان نما بندر کے تھے جنہیں مصنوعی طریقے سے پرانا اور قدیم بنایا گیا تھا اور ''قدیم'' اوزار جو فوسلز کے ساتھ تھے واضح جعلسازی کے ذریعے اس طرح بنائے گئے تھے کہ انہیں فولاد کے اوزاروں سے تیز کیا گیا تھا۔
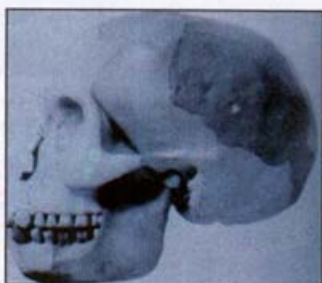
جعلی فوسل: پلٹ ڈاؤن آدمی

ان مفصل تجزیوں میں جو اوکلے، ویز اور کلارک (Oakley, Weiner, Clark) نے کیے اس جعلسازی کو ۱۹۵۳ء میں لوگوں پر منکشف کیا گیا تھا۔ یہ کھوپڑی ۵۰۰ سالہ بوڑھے انسان کی تھی اور جبڑے کی ہڈی حال ہی میں مرنے والے ایک بندر کی تھی۔ دانتوں کو اس کے بعد ایک ہی سیدھ میں ترتیب دی گئی تھی اور پھر جبڑے کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا اور جوڑوں کو اس طرح پر کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک انسان کے دانت اور جبڑے سے مشابہ نظر آئیں۔ پھر ان سب ٹکڑوں پر پوٹاشیم ڈکرومیٹ سے داغ دھبے لگا دیئے گئے تھے تاکہ یہ پرانے نظر آئیں۔ (جب تیزاب میں ڈبویا گیا تو یہ داغ دھبے دھل گئے تھے) لی گراس کلارک نے جو اس تحقیقی ٹیم کا رکن تھا اس جعلسازی کا سراغ لگا لیا تھا مگر وہ بھی اس صورتحال پر اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

دانتوں کی مصنوعی کھرچن کے ثبوت فوراً نظروں کے سامنے آ گئے تھے۔ بیشک وہ اس قدر عیاں تھے کہ یہ سوال پوچھا جا سکتا تھا: ''یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ اس سے قبل نظروں سے اوجھل رہے؟''

نبراسکا آدمی (Nebraska Man)

ہنری فیئر فیلڈ اوسبارن (Henry Fairfield Osborn) نے جو امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کا ڈائریکٹر تھا ۱۹۲۲ء میں یہ اعلان کیا کہ اسے ایک ڈاڑھ مغربی نبراسکا، سینک بروک سے ملی ہے جو عہد Pliocene (جدید تر عصر) سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پچھلی دانت میں انسان اور بندر دونوں کے پچھلی دانت کی خصوصیات ملتی تھیں۔

ایسے سائنسی بحث مباحثے شروع ہو گئے تھے جن میں کچھ نے تو اس دانت کو جاوا کے بن مانس کا دانت قرار دیا جبکہ دوسروں کے خیال میں یہ جدید دور کے انسان کے دانت کے ساتھ بہت مشابہت رکھتا تھا۔ یہ فوسل جس نے وسیع بحث کا آغاز کرا دیا تھا، اسے ''نبراسکا مین'' (نبراسکا آدمی) کا نام دے دیا گیا تھا۔ اسے پھر جلد ہی ایک سائنسی نام "Hesperopithecus Harol Cooki" بھی دے دیا گیا تھا۔

کئی صاحب الرائے لوگوں نے اوسبارن (Osborn) کی حمایت کی۔ اس دانت کو بنیاد بنا کر نبراسکا آدمی کے سر اور جسم کی تصویر بنالی گئی تھی۔ مزید یہ کہ نبراسکا آدمی کے پورے خاندان کی تصویر بھی بنائی گئی جو یقیناً تصوراتی تھی۔

اوپر دی گئی تصویر ایک واحد دانت کی بنیاد پر بنائی گئی تھی، اسے ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کے السٹریٹڈ لندن نیوز میں شائع کیا گیا تھا۔ تاہم جب یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ دانت نہ بندر نما مخلوق کا ہے نہ ہی انسان کا بلکہ یہ تو سور کی ایک ناپید ہو جانے والی نوع کا ہے تو ارتقاء پسندوں کو بے حد مایوسی ہوئی۔

پھر ۱۹۲۷ء میں ڈھانچے کے دوسرے اعضاء بھی تلاش کر لئے گئے تھے۔ نو دریافت شدہ ٹکڑوں کے مطابق یہ دانت نہ بندر کا تھا نہ ہی انسان کا۔ اب اس بات کا پتہ چلا تھا کہ یہ دانت تو ایک ایسے امریکی سور کا تھا جس کی نسل ختم ہو چکی تھی اور جسے PROSTHENNOPS کہتے تھے۔

کیا انسانوں اور بندروں کا جدِ امجد مشترک تھا؟

نظریۂ ارتقاء کے دعووں کے مطابق انسانوں اور جدید بندروں کے آباؤ اجداد مشترک ہیں۔ یہ جاندار ایک وقت ایسا تھا جب عمل تغیر سے گزرے تھے جس سے ان میں سے کچھ تو آج کے بندر بن گئے تھے جبکہ ایک دوسرا گروہ جو ایک دوسری شاخ ارتقاء میں سے گزرا اس دور کے انسانوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ارتقاء پسند انسانوں اور بندروں کے اس مشترک جدامجد کو "Australopithecus" کہتے تھے جس کا مطلب ہے "جنوبی افریقی بندر"۔ یہ بندروں کی ایک قدیم نوع سے تعلق رکھتا تھا جواب ناپید ہو چکی ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے کچھ تو تنومند ہیں جبکہ دوسرے چھوٹے اور دھان پان ہیں۔

ارتقاء پسند انسانی ارتقاء کے اگلے مرحلے کو 'ہومو' (Homo) یعنی "انسان" کہتے ہیں۔ ارتقاء پسندوں کے دعوے کے مطابق ہومو سلسلے سے تعلق رکھنے والے جاندار افریقی بندر کی نسبت زیادہ نشو و نما یافتہ ہیں اور دور جدید کے انسان سے زیادہ مختلف بھی نہیں ہیں۔ آج کے جدید انسان یعنی Homo Sapiens کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس نوع کے ارتقاء کے آخری مراحل میں متشکل ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس مخلوق کو اس تصوّراتی منظرنامے میں ارتقاء پسندوں کی زبانی افریقی بندر کہا گیا حقیقی بندر ہیں جواب ناپید ہو چکے ہیں۔ اور جن جانداروں کا ذکر ہومو سلسلے میں ہوا ہے وہ ان مختلف انسانی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے جو ماضی میں زندہ تھے اور پھر ناپید ہو گئے۔ ارتقاء پسندوں نے مختلف بندروں اور انسانوں کے فوسلز کو سب سے چھوٹے سے لے کر سب سے بڑے تک ایک ترتیب میں رکھا تاکہ "انسانی ارتقاء" کے منصوبے کو تشکیل دے سکیں۔ تاہم سائنسی حقائق بتاتے ہیں کہ ان فوسلز میں کوئی ارتقائی عمل دکھائی نہیں دیتا اور ان میں سے جن کو انسان کا جدامجد کہا ہے وہ اصلی بندر تھے جبکہ ان میں سے کچھ اصلی انسان ہیں۔

آ یئے اب ہم ایک نظر افریقی بندر پر ڈالتے ہیں جو انسانی ارتقاء کے منصوبے کے پہلے مرحلے کو جنم دیتا ہے۔

افریقی بندر (Australopithecus) — تائید بندر

ارتقاء پسندوں کا دعویٰ ہے کہ افریقی بندر (Australopithecus) دور جدید کے انسان کے قدیم آباؤ اجداد ہیں۔ یہ ایک قدیم نوع (Species) ہے جس کا ایک سر اور کھوپڑی جدید بندر کی کھوپڑی اور سر جیسی ہوتی ہے لیکن کھوپڑی کی وسعت ان کی کھوپڑی کی وسعت سے کم ہوتی ہے۔ ارتقاء پسندوں کے دعووں کے مطابق ان جانوروں کے اعضاء میں سے ایک ایسا ہوتا ہے جو انہیں انسان کے آباؤ اجداد ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور وہ ہیں اس کے دو پاؤں۔

بندروں اور انسانوں کی چال ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جو دو پاؤں پر آسانی کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔ کچھ جانور اس طرح چلنے میں محدود اہلیت رکھتے ہیں اور جو اس طرح چل سکتے ہیں ان کے ڈھانچے جھکے ہوتے ہیں۔

ارتقاء پسندوں کے نزدیک یہ افریقی بندر جھک کر چلتے تھے اور انسانوں کی مانند کھڑے ہو کر نہیں چل سکتے تھے۔ دو پاؤں پر چلنے کی یہ محدود سی صلاحیت ارتقاء پسندوں کو یہ حوصلہ بخشنے کو کافی تھی کہ یہ مخلوق انسان کے آباؤ اجداد کی تھی۔ تاہم وہ پہلا ثبوت جو ارتقاء پسندوں کے اس دعوے کی تردید کرتا تھا کہ افریقی بندر دو پایے تھے، بھی ارتقاء پسندوں ہی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ افریقی بندروں کے فوسلز پر کی گئی تحقیق نے ارتقاء پسندوں کو بھی اس بات کے ماننے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہ "بھی" بندر نما تھے۔ افریقی بندروں کے فوسلز پر تشریح الاعضاء کے حوالے سے کی گئی مفصل تحقیق نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں Charles E.Oxnard کو اس جانور کی جسمانی ساخت نے جدید انسان نما بندر (Orang-utans) کی جسمانی ساخت کی مانند قرار دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔

انسانی ارتقاء پر آج رسمی عقلمندی و دانائی کا ایک اہم حصہ افریقی بندر کے دانتوں، جبڑوں اور کھوپڑی کے ٹکڑوں کے فوسلز کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ افریقی بندر کا انسانی نسل کے ساتھ قریبی رشتہ و تعلق سچ نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام فوسلز گوریلوں، بن مانسوں اور انسانوں سے مختلف ہیں۔ گروہ کی شکل میں تحقیق کی جائے تو افریقی بندر انسان نما بندر سے زیادہ ملتا

جلتا ہے۔

جس بات نے اِرتقاء پسندوں کو زیادہ پریشان کیا وہ یہ دریافت تھی کہ افریقی بندر دو پاؤں پر جھک کر چل نہیں سکتے تھے۔ یہ بات افریقی بندر کے لئے جسمانی طور پر بہت بے اثر ہوتی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے دو پاؤں ہیں مگر وہ جھک کر چلتا ہے۔ اور وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کیونکہ قوت و دانائی کی زیادتی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ بات اس سے مشروط تھی۔ ۱۹۹۶ء میں کمپیوٹر کے ذریعے جعلسازی کی گئی تھی اور انگریز ماہر قدیم حیاتیات Robin Crompton نے بھی بتایا کہ اس قسم کی ''مخلوط'' چال (ڈگ بھرنا) ممکن نہ تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا: ایک جاندار یا تو سیدھا چل سکتا ہے یا چاروں پاؤں پر۔ ان دو کے درمیان چلنا زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ اس میں بے حد توانائی خرچ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افریقی بندر کے پاس دونوں چیزیں نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ دو پایہ بھی ہو اور جھک کر بھی چلتا ہو۔

غالباً ۱۹۹۴ء میں ایک محقق ماہر علم تشریح الاعضاء نے جس کا نام Fred Spoor تھا لیور پول یونیورسٹی برطانیہ میں اپنے رفقاء کی ٹیم کے ساتھ اس نہایت اہم تحقیقی مطالعے کو پیش کیا تھا۔ اس کا تعلق انسانی علم تشریح الاعضاء کے شعبے سے اور خلوی حیاتیات سے تھا۔ ان ماہرین نے دو پایہ جانداروں کے فوسلز پر تحقیق کی۔ ان کی تحقیق نے دریافت کیا کہ کان کے حلزونے (COCHLEA) میں پایا جانے والا غیر ارادی توازنِ میکانکی عمل اور جو دریافتیں سامنے آئیں یہ نتیجہ پیش کرتی تھیں کہ افریقی بندر انسان کی مانند دو پایہ نہیں ہو سکتا تھا۔

انسانی سلسلہ (Homo Series): اصل انسان

تصوّراتی انسانی اِرتقاء میں اگلا مرحلہ ''ہومو'' (Homo) ہے یعنی انسانی سلسلہ۔ یہ جاندار انسان ہیں جو جدید دور کے انسانوں سے مختلف نہیں مگر ان میں نسلی امتیازات پائے جاتے ہیں۔ ان امتیازات کو غلو کی حد تک لے جانے کی کوشش میں، اِرتقاء پسند ان لوگوں کو جدید انسان کی ''نسل'' کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ ایک مخلوق ''نوع'' کے طور پر لاتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ ہم جلد دیکھیں گے ''انسانی سلسلے'' کے لوگ عام انسانی نسل کی قسموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔

اِرتقاء پسندوں کی تخیلاتی پرواز کے مطابق انسانی سلسلے کا داخلی تخیلاتی اِرتقاء یہ ہے: سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہونے کا انسانی عمل۔ پھر جدید دور کے انسان کا عہد قدیم، اور نینڈرتھل

آدمی (Neanderthal Man)، ازاں بعد کرومیگن انسان (Cro-Magan Man) اور سب سے آخر میں جدید انسان۔

ارتقاء پسندوں کے دعووں کے برعکس، درج بالا تمام Species سوائے اصل انسانوں کے کچھ بھی نہیں ہیں۔ آیئے سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہونے کے انسانی عمل کا جائزہ لیتے ہیں جسے ارتقاء پسندوں نے قدیم ترین انسانی نوع کے طور پر پیش کیا ہے۔

سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ثبوت جو یہ بتاتا ہے کہ انسان کا سیدھا کھڑا ہو کر چلنا ایک ''قدیم'' نوع نہیں ہے وہ ''ترکانہ بوائے کا فوسل'' ہے جو سیدھا کھڑا ہو کر چلنے والے انسانی سلسلے کی قدیم ترین باقیات ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ فوسل ایک بارہ سالہ لڑکے کا تھا جو نو بلوغیت میں ۱.۸۳ میٹر لمبا ہوگا۔ اس فوسل کا سیدھا کھڑا ہونے والا ڈھانچہ جدید دور کے انسان کے ڈھانچے سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس کا لمبا اور دھان پان جسم کا باقی بچا ہوا پنجر بالکل ان لوگوں کے پنجروں جیسا ہے جو آج منطقہ حارہ میں واقع علاقوں میں بستے ہیں۔ یہ فوسل ثبوت کا ایک نہایت اہم ٹکڑا ہے کہ سیدھا کھڑا ہو کر چلنے والا انسان جدید انسانی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ارتقاء پسند ماہر قدیم حیاتیات رچرڈ لیکے سیدھا کھڑا ہو کر چلنے والے انسان کا درج ذیل طور پر جدید انسان سے موازنہ کرتا ہے:

''کھوپڑی کی ساخت، باہر کو نکلے ہوئے چہرے، بھنوؤں کا گھنا ہونا وغیرہ میں بھی ہمیں فرق نظر آئے گا۔ جہاں تک جدید انسان کی علیحدہ علیحدہ جغرافیائی نسلوں کا تعلق ہے اس حوالے سے ان امتیازات کا غالباً اب اس قدر اعلان نہیں کیا جاتا جس قدر ہم انہیں دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے حیاتیاتی امتیازات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب آبادیوں کو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے مختلف مدتوں کے لئے جدا جدا کر دیا جاتا ہے''۔

لیکے کہنا یہ چاہتا ہے کہ کھڑے ہو کر چلنے والے انسان اور ہمارے درمیان اس سے زیادہ فرق نہیں جس قدر حبشیوں اور اسکیموؤں کے درمیان ہے۔ کھڑا ہو کر چلنے والے انسانوں کی کھوپڑی کے خدوخال ان کے خوراک کھلانے کے طریقے اور جینیاتی منتقلی ان کے دوسری انسانی نسلوں سے زیادہ لمبے عرصے تک میل جول نہ رکھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

اس بات کا ایک اور مضبوط ثبوت کہ کھڑے ہو کر چلنے والے انسان ''قدیم'' نوع سے تعلق نہیں رکھتے، اُس وقت سامنے آیا جب اس نوع کے فوسلز جن کی عمر ۲۷ ہزار برس بلکہ ۱۳ ہزار برس

بتی ہے انہیں زمین کھود کر نکالا گیا تھا۔ ایک مضمون کے مطابق جو "ٹائم" میں شائع ہوا، (جو بیشک سائنسی جریدہ نہ تھا مگر سائنسی دنیا پر اس کا بڑا دوررس اثر ہوا۔) کھڑے ہو کر چلنے والے جاندار کے ۲۷ ہزار سالہ قدیم فوسل جزیرہ جاوا سے ملے تھے۔ آسٹریلیا کے دلدلی علاقے Kow میں ۱۳ ہزار سالہ پرانے فوسلز ملے تھے جن میں جدید اور قدیم انسان کی صفات پائی جاتی تھیں۔ ان تمام فوسلز سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم انسان آج کے اس عہد سے ماضی قریب تک میں زندہ تھا اور یہ نسل انسانی کے سوا کچھ نہ تھے جواب تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکے ہیں۔

قدیم انسان اور نینڈر تھل آدمی

تصوراتی ارتقائی اسکیم میں قدیم انسان عصر حاضر کے انسان کی سابقہ شکل ہے۔ دراصل ارتقاء پسندوں کے پاس ان انسانوں کے بارے میں کہنے کو زیادہ کچھ موجود نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اور دور جدید کے انسان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ چند محققین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس نسل کے نمائندے تو آج بھی زندہ ہیں۔ اور اس کی مثال پیش کرتے وقت وہ آسٹریلیا کے ابتدائی باشندوں (Aborigines) کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قدیم انسانوں (Homo Sapiens) کی طرح یہ آسٹریلوی باشندے گھنی اور باہر کی طرف ابھری ہوئی بھنویں رکھتے تھے۔ اور ان کے جبڑے کی ساخت بھی اندر کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ اور ان کی کھوپڑی کا حجم بھی قدرے چھوٹا ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ کئی قابل ذکر دریافتوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ایسے لوگ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہنگری اور اٹلی کے کچھ دیہات میں آباد تھے۔

ارتقاء پسند ان انسانی فوسلز کا حوالہ دیتے ہیں جو ہالینڈ کی نینڈر وادی میں زمین کھود کر نکالے گئے تھے انہیں نینڈر تھل آدمی کہا جاتا ہے۔ بہت سے معاصر محققین نینڈر تھل آدمی کو جدید انسان کی ذیلی نوع قرار دیتے ہیں۔ اور اسے "Homo Sapiens Neandarthal" کہتے ہیں یہ بات یقینی ہے کہ یہ نسل جدید انسانوں کے ساتھ ایک ہی زمانے میں ایک ہی مقام پر آباد تھی۔ جو دریافتیں سامنے آئی ہیں ان کے مطابق نینڈر تھل آدمی اپنے مرنے والوں کو دفن کرتے تھے، آلات موسیقی بناتے تھے اور اسی عہد میں بسنے والے قدیم انسانوں کے ساتھ ان کے تہذیبی و ثقافتی روابط تھے۔ نینڈر تھل آدمی کے فوسلز کی بالکل جدید انسانوں کی جیسی کھوپڑیوں اور پنجر پر کسی قیاس آرائی یا ظن و تخمین سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

اس موضوع پر ایک مشہور اتھارٹی ERIK TRINKAUS کی ہے جو نیو میکسیکو یونیورسٹی سے وابستہ ہے۔ وہ لکھتا ہے:

نینڈر تھل کے پنجر کی باقیات کا جدید انسانوں کے پنجر کے ساتھ جزئیات کی حد تک موازنہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ نینڈر تھل کے اعضاء ایسے ہیں جن میں کوئی بھی اہلیت مثلاً نقل و حرکت، چالاکی وہوشیاری، ذہانت یا لسانی ایسی نہیں جو جدید انسانوں سے کم تر ہو۔

دراصل نینڈر تھل کو جدید انسانوں پر کچھ ''ارتقائی'' فوائد کی برتری حاصل ہے۔ نینڈر تھل کی کھوپڑی جدید انسان کی کھوپڑی کی نسبت بڑی ہوتی ہے۔ اور وہ ہماری نسبت زیادہ تنومند اور اچھے جسم کے مالک ہیں۔ TRINKAUS اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''نینڈر تھل کے خدوخال میں ایک شے بڑی نمایاں ہے اور وہ ہے ان کے دھڑ اور پٹھوں کی ہڈیوں کا بڑا ہونا۔ وہ تمام ہڈیاں جو محفوظ کر لی گئی تھیں ایک ایسی طاقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو شاید ہی جدید انسانوں کو میسر آئی ہوگی۔ یہ طاقت نہ صرف مردوں میں پائی جاتی ہے بلکہ یہ بالغ خواتین میں، نوجوانوں اور بچوں تک میں پائی جاتی ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نینڈر تھل وہ خاص نسل انسانی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ دوسری نسلوں کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔

اس ساری تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ ''انسانی اِرتقاء'' کا منظر نامہ جسے اِرتقاء پسندوں نے جعلسازی سے تیار کیا تھا ان کے تخیل کی پیداوار ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہمیشہ انسان اور بندر ہمیشہ بندر ہی تھے۔

کیا اِرتقاء کی دلیل کے مطابق زندگی اتفاقات اور انطباق سے وجود میں آسکتی ہے؟

نظریۂ اِرتقاء کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی ایک ایسے خلیے سے وجود میں آئی جو اتفاق سے قدیم ارضی حالات کے تحت متشکل ہو گیا تھا۔ آیئے ہم خلیے کی تشکیل کا سادہ سی نظیر کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں تاکہ ہم یہ بتا سکیں کہ خلیے کی موجودگی کو قدرتی مظاہر اور اتفاقات پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ اس کی ساخت جو ابھی تک ویسی ہی ہے کئی لحاظ سے اب بھی اپنی پراسراریت کو قائم رکھے ہوئے ہے، اور ایسا اس وقت ہے جب ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں۔ اپنی تمام تر

سرگرمیوں کے نظاموں کے ساتھ جن میں نظام مواصلات، نقل و حمل اور نظم و نسق شامل ہیں ایک خلیہ کسی شہر کی نسبت کم مکمل و پیچیدہ نہیں ہے: اِس کے اندر ایسے پاور سٹیشن ہیں جو اس توانائی کو پیدا کرتے ہیں جسے خلیہ استعمال کرتا ہے، وہ کارخانے استعمال کرتے ہیں جو ایسے خامرے اور ہارمونز پیدا کرتے ہیں جو زندگی کے لئے لازمی ہیں۔ وہ ڈیٹا بنک (Databank) استعمال کرتا ہے جہاں پیدا کی جانے والی تمام مصنوعات کے بارے میں معلومات ریکارڈ ہوتی ہے، پیچیدہ نظام ہائے نقل و حمل اور ایسی پائپ لائنیں جو خام مواد اور پیداواری اشیاء کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتی ہیں۔ جدید لیبارٹریاں اور ریفائنریاں ہیں جو خارجی خام مواد کو ان کے قابل استعمال حصوں میں توڑتی ہیں اور اندر آنے اور باہر جانے والے مواد کو کنٹرول کرنے کے لئے خصوصی خلوی جھلی دار لحمیات ہیں۔ اور یہ اس ناقابل یقین حد تک پیچیدہ نظام کا ایک چھوٹا سا حصہ تشکیل دیتی ہیں۔

قطع نظر اس بات کے کہ یہ خلیہ قدیم ارضی حالات کے تحت متشکل ہوا، اس کی تالیف اور میکانکی نظام کو ہمارے عہد کی جدید تجربہ گاہوں میں بھی ترکیب نہیں دیا جا سکتا۔ خلیے کے امینو ترشوں اور تعمیری سہاروں کے استعمال سے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ مکمل خلیہ تو کجا خلیے کا واحد عضو مثلاً خیطی ریزہ (Mitochondria) یا رائبوسوم (Ribosome) ہی بنایا جا سکے۔ پہلا خلیہ جو نظریۂ ارتقاء کے دعوے کے مطابق اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا اسی طرح تخیل کی پیداوار ہے جیسے داستانی یا فرضی حیوان۔

لحمیات اتفاق یا انطباق کیلئے ایک چیلنج ہے

اور صرف ایک خلیہ ہی پر موقوف نہیں: ان ہزاروں پیچیدہ و جامع لحمیاتی سالموں میں سے ایک کا بھی قدرتی حالات کے تحت اتفاقاً وجود میں آ جانا ناممکن ہے۔

لحمیات بہت بڑے سالمے ہوتے ہیں جو اُن امینو ترشوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو مختلف مقداروں اور ساختیاتی جسموں کے ساتھ ایک خاص ترتیب میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سالمے ایک جاندار خلیے کے تعمیری سہاروں سے بنتے ہیں۔ سادہ سا خلیہ بھی ۵۰ امینو ترشوں سے بنتا ہے لیکن کچھ لحمیات ایسے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں امینو ترشے ہوتے ہیں۔ جاندار خلیوں میں ایک لحمیے کی ساخت میں کسی ایک امینو ترشے کی کمی، بیشی یا تبدیلی، جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص کام

ہوتا ہے لحمیے کو ایک بیکار سالماتی ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔ نظریۂ ارتقاء جب امینو ترشوں کی ''اتفاقیہ تشکیل'' کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتا ہے تو لحمیات کی تشکیل کے معاملے میں بھی اسے مایوسی ہوتی ہے۔

بیس مختلف امینو ترشے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ایک اوسط سائز کا لحمیاتی سالمہ ۲۸۸ امینو ترشے رکھتا ہے تو ترشوں کے ''۱۰^۳۰۰'' مختلف مجموعے ہوتے ہیں۔ ان تمام ممکنہ ترتیبوں میں صرف ایک ترتیب ایسی ہوتی ہے جو مطلوبہ لحمیاتی سالمے کو متشکل کرتی ہے۔ بقیہ امینو ترشوں کی زنجیریں ہوتی ہیں جو یا تو بالکل بیکار ہوتی ہیں یا جانداروں کے لئے امکانی طور پر ضرر رساں۔ دوسرے لفظوں میں مذکورہ بالا صرف ایک لحمیاتی سالمے کی اتفاقیہ تشکیل کا امکان ''۱۰^۳۰۰'' میں سے ''۱'' رہ جاتا ہے۔ اس ''۱'' کے واقع ہونے کا امکان کہ یہ ایک ''فلکیاتی'' تعداد میں سے جو ۱ پر مشتمل ہو اور جس کے بعد ۳۰۰ صفر آتے ہوں عملاً ناممکن ہے۔ مزید یہ کہ ایک لحمیاتی سالمہ جس میں ۲۸۸ امینو ترشے ہوں، اس کا اگر کچھ قوی ہیکل لحمیاتی سالموں کے ساتھ موازنہ کیا جائے جن میں ہزاروں امینو ترشے ہوتے ہیں تو وہ ان کے مقابلے میں بہت چھوٹا سا دکھائی دے گا۔ جب ہم اس امکانی صورت کے اندازوں کو ان قوی ہیکل لحمیاتی سالموں پر منطبق کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ ''ناممکن'' بھی موزوں نہیں دکھائی دیتا۔

اگر ان لحمیات میں سے ایک کا بھی اتفاقاً وجود میں آ جانا ناممکن ہو تو ان ایک ملین لحمیات کے لئے ایک خاص ترتیب سے اتفاقاً یکجا ہو جانا کئی بلین مرتبہ زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مکمل انسانی خلیے کو بنا سکیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک خلیہ کسی بھی وقت لحمیات کا محض ایک ڈھیر نہیں ہوتا۔ لحمیات کے علاوہ ایک خلیے میں مرکزائی ترشے (Nucleic acids) بھی شامل ہوتے ہیں، کاربوہائیڈریٹ بھی، شحمے (Lipids) وٹامنز اور بہت سے کیمیائی مادے مثلاً برق پاش جو ایک خاص تناسب اور ہم آہنگی سے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن میں بھی ساخت اور کام دونوں اعتبار سے ایک خاص تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مختلف خلوی اعضاء میں تعمیری سہارے یا ایک جزو ترکیبی کے طور پر کام کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ایک خلیے کے کئی ملین لحمیات میں سے صرف ایک کے متشکل ہونے کے بارے میں ارتقاء پسند کچھ نہیں بتا سکتا۔

ترکی کے Dr. Ali Demirsoy جو اپنے وطن میں ارتقاء پسندانہ فکر کے حوالے سے

ایک بہت بڑی اتھارٹی تصور کیے جاتے ہیں، خلوی رنگتوں (Cytochrome-C) جو زندگی کے لئے لازمی ہوتی ہیں کی اتفاقیہ تشکیل کے امکان پر اپنی کتاب "Kalitimve Evrim" (موروثیت اور ارتقاء) میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک Cytochrome-C کے ترتیب کے ساتھ متشکل ہونے کا امکان صفر کے برابر ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر زندگی کو ایک خاص نظم وترتیب کی ضرورت ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پوری کائنات میں صرف ایک بار اس کے حصول کا امکان ہے وگرنہ کچھ مابعدالطبیعاتی قوتیں ایسی ہیں (جن کی تشریح ہمارے بس میں نہیں) جنہوں نے اس کو متشکل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہوتا۔مؤخرالذکر کو تسلیم کر لینا سائنسی اہداف کے حصول کے لئے موزوں نہیں ہے۔اس لئے ہمیں پہلے مفروضے کی طرف دیکھنا ہوگا۔

ان سطور کے بعد Dr. Demirsoy یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ امکانیت کس قدر غیر حقیقی ہے جسے اس نے صرف اس لئے تسلیم کر لیا تھا کیونکہ یہ ''سائنس کے اہداف کے لئے زیادہ موزوں تھی''۔

CYtochrome-C (خلوی رنگتوں) کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مخصوص امینو ترشوں کی فراہمی کا امکان اسی قدر کم ہے جس قدر ایک بندر کے تاریخ انسانیت کے ایک ٹائپ مشین پر لکھنے کا۔اس بات کو بلاحیل وحجت تسلیم کر لیا جانا چاہئے کہ بندر ٹائپ مشین کی کلیدوں پر الل ٹپ پنجے مارے گا۔

جانداروں میں موجود لحمیاتی سالمے کے متشکل ہونے کے لئے موزوں امینو ترشوں کا صحیح ترتیب میں ہونا ہی کافی نہیں ہے۔اس کے علاوہ ان ۱۲۰ امینو ترشوں میں سے ہر ایک کا بایاں ہاتھ استعمال کرنا ضروری ہے جو لحمیات کی تالیف میں موجود ہوں۔کیمیائی طور پر دو مختلف قسم کے امینو ترشے ہوتے ہیں جنہیں ''بائیں ہاتھ والے'' اور ''دائیں ہاتھ والے'' کہا جاتا ہے ان میں فرق اس Mirror Symmetry کا ہوتا ہے جو ان کے سہ جہتی اجسام میں ہوتا ہے جو ایک انسان کے دائیں اور بائیں ہاتھ جیسا ہوتا ہے۔دونوں قسموں کے یہ امینو ترشے نیچر میں مساوی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور وہ بڑی عمدگی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔تاہم ایک حیرت انگیز حقیقت تحقیق کے ذریعے سامنے آئی ہے: جانداروں کی ساخت میں شامل تمام لحمیات میں بائیں ہاتھ والے امینو ترشے پائے جاتے ہیں۔اگر کسی لحمیے کی ساخت میں ایک بھی دائیں ہاتھ

والا امینو ترشہ رہ جائے تو وہ اسے بیکار بنا دیتا ہے۔

آیئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی جیسا کہ اِرتقاء پسندوں کا دعویٰ ہے۔ اس صورت میں دائیں اور بائیں ہاتھ والے امینو ترشے نیچر میں تقریباً یکساں تعداد میں ہونے چاہئیں تھے۔ لحمیات کس طرح تمام امینو ترشوں میں سے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشے چن لیتے ہیں اور زندگی کے عمل میں ایک بھی دائیں ہاتھ والا امینو ترشہ کیوں شامل نہیں ہو پاتا، اِرتقاء پسندوں کو یہ سوال بہت پریشان کئے ہوئے ہے۔

برطانیکا سائنس انسائیکلو پیڈیا میں، جو اِرتقاء کا پر جوش محافظ ہے، یہ لکھا ہوا ہے کہ کرۂ ارض پر موجود تمام جاندار نامیوں کے امینو ترشے اور پیچیدہ کثیر سالمی مرکبات کے تعمیری سہارے مثلاً لحمیات میں وہی بائیں ہاتھ والا تناسب اور خوبصورتی پائی جاتی ہے اس میں اضافہ کر کے کہا جائے تو بات یہ بنتی ہے کہ یہ ایک سکے کو کئی ملین بار ہوا میں پھینکنا ہے۔ جو ہر بار اس طرح زمین پر گرتا ہے کہ اس کا "سر" والا حصہ ہی جیتنے والے کے حصے میں آتا ہے۔ اسی انسائیکلو پیڈیا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ سالمے بائیں یا دائیں ہاتھ والے کیوں بن جاتے ہیں اور اس انتخاب کو بڑے مسحور کن انداز میں کرۂ ارض پر موجود زندگی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

امینو ترشوں کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کو صحیح تعداد، صحیح ترتیب اور مطلوبہ سہ جہتی ساختیاتی جسموں میں رکھا جائے۔ ایک لحمیے کی تشکیل یہ بھی چاہتی ہے کہ ایسے سالماتی امینو ترشے جن کا ایک سے زیادہ بازو ہو مختلف بازوؤں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں۔ اس قسم کے ملاپ کو "پپٹائیڈ ملاپ" کا نام دیا گیا ہے۔ امینو ترشے ایک دوسرے کے ساتھ مختلف بندھنوں میں جکڑے جا سکتے ہیں مگر لحمیات صرف اور صرف ان امینو ترشوں سے مل کر بنتے ہیں جن کو "پپٹائیڈ ملاپ" کے ذریعے جوڑ دیا جاتا ہے۔

تحقیق نے یہ بات منکشف کی ہے کہ وہ امینو ترشے جو الل ٹپ اکٹھے ہو جاتے ہیں وہ ۵۰% کے تناسب سے "پپٹائیڈ ملاپ" سے یکجا ہوتے ہیں اور بقیہ دیگر ان بندھنوں کے ساتھ یکجا ہو جاتے ہیں جو لحمیات میں موجود نہیں ہوتے۔ صحیح طور پر کام کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ امینو ترشہ جو ایک لحمیہ بنا رہا ہے صرف اس بپٹائڈ ملاپ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو کہ اسے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشوں سے انتخاب کرنا ہے۔ بے شک ایسا کوئی کنٹرول میں رکھا جانے والا میکانکی عمل نہیں ہے جس کے ذریعے انتخاب کرتے وقت دائیں ہاتھ والے امینو ترشوں

کو باقی رہنے دیا جائے، اور ذاتی طور پر یہ یقین کر لیا جائے کہ ہر امینو ترشہ دوسرے امینو ترشے کے ساتھ بپٹائڈ ملاپ کے ذریعے یکجا ہو گیا ہے۔

ان حالات میں ایک اوسط درجے کے لحمیاتی سالمے کے لئے جس میں ۵۰۰ امینو ترشے صحیح مقدار اور ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اس میں شامل تمام امینو ترشے صرف بائیں ہاتھ والے ہیں اور ان کو صرف بپٹائڈ ملاپوں کے ذریعے یکجا کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب اور مقدار درج ذیل ہونی چاہئے:

...... صحیح ترتیب میں ہونے کا امکان = $1/20^{500} = 1/10^{650}$

...... بائیں ہاتھ والے ہونے کا امکان = $1/2^{500} = 1/10^{150}$

...... ''پپٹائڈ ملاپ'' کے ذریعے یکجا ہونے کا امکان = $1/2^{499} = 1/10^{150}$

میزان امکانیت = $1/10^{950}$ یعنی ''۱'' امکان 10^{950} پر

جیسا کہ نیچے دکھایا جا رہا ہے ایک لحمیاتی سالمے کے ۵۰۰ امینو ترشوں سے تشکیل کا امکان ''۱'' ہے جو ۱ کے بعد ۹۵۰ صفر ڈالنے کے بعد بنتا ہے اور یہ وہ تعداد ہے جو انسانی ذہن کے ادراک سے باہر ہے۔ اور یہ وہ امکانیت ہے جو صرف کاغذ پر ہے۔ عملاً اس بات کے ممکنہ حصول کا امکان صفر ہے۔ ریاضی کا فارمولا استعمال کیا جائے تو وہ امکانیت جو $1/10^{50}$ سے کم ہو وہ اعداد و شمار کے

ایک اس اوسط لحمیاتی سالمے کا امکان، جو ۵۰۰ امینو ترشوں سے بنتا ہے، جنہیں صحیح تعداد میں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ تمام امینو ترشوں کے امکان کے علاوہ اس میں صرف بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں اور انہیں پیپٹائڈ بندھنوں سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ ''$1 \text{ over } 10^{950}$'' ہوتا ہے۔ ہم اس عدد کو درج ذیل طریقے سے لکھ سکتے ہیں، جو ''۱'' کے بعد ۹۵۰ صفر ڈالنے سے بنتا ہے۔

$$10^{950} =$$

اعتبار سے قابل حصول ہونے کی ''صفر'' امکانیت رکھتی ہے۔

جب ایک ایسے لحمیاتی سالمے کے متشکل ہونے کی امکانیت اس حد تک پہنچ جاتی ہے جو ۵۰۰ امینوترشوں سے بنتا ہے تو ہم ذہنی حدود کو زیادہ سطح کی عدم امکانیات کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ ''ہوموگلوبین'' سالمے میں، جو ایک اہم لحمیہ ہوتا ہے، ۵۷۴ امینوترشے ہوتے ہیں جو ان امینو ترشوں سے زیادہ ہوتے ہیں جو مذکورہ بالا لحمیہ بناتے ہیں۔ اسے اپنے جسم کے سرخ خون کے کئی بلین خلیوں میں سے صرف ایک تصور کریں۔ انسانی جسم میں ۲۸۰,۰۰۰,۰۰۰ (۲۸۰ ملین) ہوموگلوبین سالمے ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے یہی ایک سرخ خون کا خلیہ ہے۔ اس کرۂ ارض کی عمر ایک واحد لحمیے کو بھی ''سعی وخطا'' (Trial & error) کے طریقے سے متشکل کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ارتقاء امکانیت کی ایک خطرناک کھائی میں اسی وقت گر جاتا ہے جب ایک لحمیہ متشکل ہو رہا ہو۔

تخلیق زندگی کے بارے میں جوابات کی تلاش

اتفاقاً وجود میں آ جانے والی زندگی کے امکان سے متعلق پائے جانے والے شدید اختلافات سے بخوبی باخبر ہوتے ہوئے ارتقاء پسند اپنے اعتقادات کے بارے میں کوئی بھی استدلالی تشریح یا وضاحت پیش نہ کر سکتے تھے جس کی وجہ سے وہ اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ایسے طریقے اختیار کریں جن سے یہ ظاہر کر سکیں کہ اختلافات کچھ زیادہ حوصلہ شکن نہ تھے۔

تجربہ گاہوں میں کئی تجربات کئے گئے تھے تاکہ اس سوال کا جواب دیا جا سکے کہ بے جان مادے سے زندگی کیسے وجود میں آ گئی تھی۔ ان تجربات میں سے سب سے زیادہ معروف اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے والا تجربہ ''ملر تجربہ'' یا ''یورے ملر تجربہ'' کہلاتا ہے جو ایک امریکی محقق سٹینلے ملر نے ۱۹۵۳ء میں کیا تھا۔

یہ ثابت کرنے کی غرض سے کہ امینوترشے اتفاقاً وجود میں آ گئے ہوں گے ملر نے اپنی تجربہ گاہ میں ایک ماحول تیار کیا جو اس کے خیال میں قدیم کرۂ ارض پر کبھی موجود تھا (جو بعد میں غیر حقیقی ثابت ہوا تھا) اور پھر وہ اپنے تجربے میں مصروف ہو گیا تھا۔ جو آمیزہ اس نے اس قدم ارضی ماحول کے لئے استعمال کیا اس میں ایمونیا، میتھین، ہائیڈروجن اور آبی بخارات شامل تھے۔

ملر جانتا تھا کہ قدرتی حالات کے تحت میتھین، ایمونیا، ہائیڈروجن اور آبی بخارات ایک

دوسرے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ردعمل پیدا کرنے کے لئے اسے آمیزے میں توانائی داخل کرنی تھی۔ اس نے تجویز کیا کہ یہ توانائی قدیم ترین زمین کے کرۂ ہوائی میں بجلی کی چمک سے حاصل کی گئی ہوگی اور اس مفروضے پر انحصار کرتے ہوئے اس نے اپنے تجربات میں مصنوعی برقی اخراج سے کام لیا تھا۔

ملر نے ایک ہفتے تک اس گیسی آمیزے کو ۱۰۰ اسی پر اُبالا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے میں برقی رو چھوڑ دی تھی۔ ملر نے ایک ہفتہ گزرنے کے بعد تجربہ گاہ کے اندر بننے والے کیمیائی مادوں کا تجزیہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ ۲۰ امینوترشوں میں سے لحمیات کے بنیادی عناصر کو تشکیل دینے والے تین امینوترشے مرکب سازی کر چکے تھے۔

اس تجربے سے ارتقاء پسندوں کو بڑا حوصلہ ملا اور اسے ایک نمایاں کامیابی سمجھا گیا تھا۔ اس خیال سے ہمت پا کر کہ اس تجربے نے ان کے نظریے کی تصدیق کر دی ہے ارتقاء پسندوں نے فوراً نئے منظر نامے پیش کر دیئے تھے۔ ملر نے قیاساً یہ ثابت کر دیا تھا کہ امینوترشے ازخود متشکل ہو سکتے تھے۔ اس پر بھروسہ کرتے ہوئے بعد کے مراحل تیزی کے ساتھ قیاس میں لائے گئے تھے۔ اس منظر نامے کے مطابق بعد ازاں امینوترشے حادثے کے طور پر ایک خاص ترتیب سے یکجا ہو گئے تھے تاکہ لحمیات کی تشکیل کر سکیں۔ اس طرح اتفاقاً وجود میں آنے والے لحمیات میں سے کچھ نے اپنے آپ کو ان ساختیاتی اجسام کی مانند خلوی جھلی کے اندر رکھ لیا تھا جو کسی طرح وجود میں آ گئے تھے اور ایک قدیم خلیے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک خاص وقت کے اندر یکجا ہو کر ان خلیوں نے جاندار نامیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس منظر نامے کا سب سے بڑا اسہارا ملر کا تجربہ تھا۔

تاہم ملر کا تجربہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کہ جو کئی پہلوؤں سے باطل ثابت ہو چکا تھا۔

ملر کا تجربہ باطل و غیر معتبر تھا

ملر کے تجربے کو اب نصف صدی گزر چکی ہے اور اسے بہت سے پہلوؤں سے باطل اور غیر معتبر قرار دیا جا چکا ہے مگر ارتقاء پسند ہیں کہ اب بھی اسے ایک ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں کہ زندگی بے جان مادے سے اچانک وجود میں آ سکتی تھی۔ جب ملر کے تجربے کا بلا کسی تعصب کے ناقدانہ جائزہ لیا جائے اور ارتقاء پسندوں کے موضوعی نقطہ نظر کو سامنے رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ صورت حال اتنی بھی اُمید افزا نہیں جس قدر وہ چاہتے ہیں کہ ہم سمجھ لیں۔ ملر کا ہدف یہ ثابت

کرنا تھا کہ قدیم ترین ارضی حالات کے تحت امینو ترشے خودبخود متشکل ہو سکتے تھے۔ کچھ امینو ترشے پیدا کیے گئے تھے مگر ہم دیکھیں گے کہ یہ تجربہ اس ہدف سے کئی پہلوؤں سے خود متصادم نظر آتا ہے۔

ایک میکانکی عمل استعمال کرنے سے جسے ''سرد پھندا'' کہا گیا ملر نے امینو ترشوں کو متشکل ہوتے ہی ان کے ماحول سے جدا کر دیا تھا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو ماحول کے حالات نے سالموں کو فوراً نیست و نابود کر دیا ہوتا۔

یہ فرض کرنا بالکل بے معنی نظر آتا ہے کہ اس قسم کا کوئی شعوری میکانکی عمل قدیم ارضی حالات کے تحت ایسا تھا جس میں بالائے بنفشی شعاعوں، بجلی کے کڑکوں، مختلف کیمیائی مادوں، اور زیادہ فیصد آزاد آکسیجن شامل تھے۔ اور اس قسم کے میکانکی عمل کے بغیر کوئی بھی امینو ترشہ جو متشکل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوتا فوری طور پر تباہ کر دیا گیا ہوتا۔ ملر نے اپنے تجربے میں جس قدیم ارضی ماحول کو پیدا کرنا چاہا وہ حقیقت پر مبنی نہ تھا۔ نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو قدیم ارضی کرۂ ہوائی کے عناصر ترکیبی میں شامل ہونا چاہیئے تھا مگر ملر نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اور ان کی جگہ اس نے میتھین اور ایمونیا استعمال کی تھی۔

ایسا کیوں؟ ارتقاء پسند اس بات پر کیوں مصر تھے کہ قدیم ارضی کرۂ ہوائی میں میتھین (CH_4)، ایمونیا (NH_3) اور آبی بخارات (H_2O) کی زیادہ مقدار شامل تھی۔ جواب بالکل سیدھا سادہ ہے: ایمونیا کے بغیر ایک امینو ترشے کی مرکب سازی ناممکن تھی۔ Kevin Mc kean اپنے ایک مضمون میں، جو Discover رسالے میں شائع ہوا اس بارے میں لکھتا ہے:

ملر اور یورے نے زمین کے قدیم کرۂ ہوائی کی نقالی کے لئے میتھین اور ایمونیا کا آمیزہ استعمال کیا۔ ان کے نزدیک یہ زمین دھات، چٹانوں اور برف کا ہم صورت آمیزہ تھا۔ تاہم بعد کے تحقیقی جائزوں سے پتہ چلا کہ اس زمانے میں زمین بے حد گرم تھی اور یہ پگھلے ہوئے نکل اور لوہے سے مل کر بنی تھی۔ اس لئے اس زمانے کا کیمیائی کرۂ ہوائی زیادہ تر نائٹروجن (N_2) کاربن ڈائی آکسائڈ (Co_2) اور آبی بخارات (H_2O) سے مل کر بننا چاہیئے تھا تاہم نامیاتی سالموں کے لئے یہ میتھین اور ایمونیا کی نسبت زیادہ موزوں نہیں ہے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد ملر نے خود بھی اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے اپنے تجربے میں جو کرۂ ہوائی سے متعلق ماحول استعمال کیا تھا وہ حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔

ایک اور اہم بات جو ملر کے تجربے کو باطل ٹھہراتی ہے، یہ ہے کہ تمام امینو ترشوں کو اس وقت کرۂ ہوائی کے اندر تباہ کرنے کے لئے کافی آکسیجن موجود تھی جب یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ متشکل ہو چکے ہیں۔ اس آکسیجن کی موجودگی کو امینو ترشوں کے متشکل ہونے کی راہ میں مزاحم ہونا چاہئے تھا۔ یہ صورت حال ملر کے اس تجربے کی مکمل طور پر نفی کرتی ہے۔ جس میں آکسیجن کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اگر اس تجربے میں آکسیجن استعمال کر لی گئی ہوتی تو میتھین کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں تحلیل ہو گئی ہوتی۔ اور ایمونیا، نائٹروجن اور پانی میں تحلیل ہو گئی ہوتی۔

دوسری طرف قابل غور بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اوزون کی تہ ابھی تک موجود نہ تھی اور زمین پر کوئی نامیاتی سالمہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو شدید بالائے بنفشی شعاعوں سے بالکل غیر محفوظ تھی۔

چند امینو ترشوں کے علاوہ جو زندگی کے لئے لازمی ہیں ملر کے تجربے نے بہت سے نامیاتی ترشے پیدا کئے تھے جن میں ایسی خاصیتیں موجود تھیں جو جانداروں کی ساخت اور کام کے لئے بہت ضرر رساں اور مہلک ہوتی ہیں۔ اگر امینو ترشوں کو الگ نہ کر لیا گیا ہوتا اور انہیں اسی ماحول میں ان کیمیائی مادوں کے ساتھ نہ چھوڑ دیا گیا ہوتا تو کیمیائی ردعمل کی وجہ سے ان کی تباہی اور مختلف آمیختوں میں ان کی منتقلی ناگزیر تھی۔ مزید یہ کہ دائیں ہاتھ والے امینو ترشے زیادہ تعداد میں متشکل ہو گئے تھے۔ صرف ان امینو ترشوں کی موجودگی ہی کافی تھی جو اس نظریے کو اس کے تمام استدلال کے باوجود مسترد کرتی تھی۔ اس لئے کہ دائیں ہاتھ والے امینو ترشے ان امینو ترشوں میں سے تھے جو جاندار نامیاتی اجسام کی تالیف میں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور جو لحمیات کو اس وقت بیکار ٹھہرا دیتے ہیں جب وہ ان کی تالیف میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ملر کے تجربے میں جن حالات میں امینو ترشے متشکل ہوئے تھے وہ زندگی کے لئے موزوں نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس واسطے (medium) نے ایک تیزابی آمیزے کی شکل اختیار کر لی تھی جس نے ان مفید سالموں کو تباہ کر دیا تھا اور ان کی تکسید کر دی تھی جن کو حاصل کر لیا گیا تھا۔

جیسا کہ وہ اس بات کے خوگر ہیں ارتقاء پسند اس "تجربہ" کو سامنے لا کر خود ہی نظریۂ ارتقاء کو مسترد کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ تجربہ کچھ ثابت بھی کرتا ہے تو وہ اس قدر ہے کہ امینو ترشے صرف ایک زیر کنٹرول تجربہ گاہ کے ماحول میں پیدا کئے جا سکتے ہیں جہاں ایک مخصوص قسم کے حالات

خاص طور پر شعوری مداخلت سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

گویا یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ (یہاں تک کہ امینو ترشوں کی "مختصر زندگی" Near Life بھی) زندگی کو وجود میں لاتا ہے وہ غیر شعوری اتفاق نہیں ہوسکتا بلکہ کسی کی ایک شعوری مرضی سے ایسا ہوتا ہے جسے ایک لفظ میں تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کا ہر مرحلہ زندگی کے وجود اور اللہ کے جلیل القدر ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

ڈی این اے (DNA): حیرت انگیز سالمہ

نظریۂ ارتقاء ان سالموں کی موجودگی کی منطقی وضاحت پیش کرنے میں ناکام رہا ہے جو ایک خلیے کی بنیاد ہوتے ہیں نہ ہی وہ جینیات کی سائنس اور نیوکلینی ترشوں کی دریافت (DNA & RNA) کی وضاحت کر سکے ہیں، جنہوں نے نظریۂ ارتقاء کے لئے بالکل نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ڈی این اے پر دو سائنسدانوں جیمز واٹسن اور فرانسس کرک کے کام نے حیاتیات میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا تھا۔ بہت سے سائنسدانوں نے ان کی توجہ جینیات کی سائنس کی طرف مبذول کرائی تھی۔ آج برسوں کی تحقیق کے بعد ڈی این اے کی ساخت کافی حد تک منکشف ہوگئی ہے۔

اب ہم ڈی این اے کی ساخت اور کام پر بنیادی معلومات دینا چاہیں گے:

وہ سالمہ جسے ڈی این اے کہتے ہیں اور جو ہمارے جسم کے ۱۰۰ ٹریلین خلیوں میں سے ہر ایک میں پایا جاتا ہے، اس میں مکمل انسانی جسم کی تعمیر کا منصوبہ ہوتا ہے۔ ایک خاص کوڈ پر مشتمل نظام کے ذریعے کسی انسان کی تمام صفات سے متعلق معلومات، جسمانی خدوخال سے لے کر داخلی اجزاء کی ساخت تک ریکارڈ کر لی جاتی ہیں۔ ڈی این اے میں موجود وہ معلومات چار خاص بنیادوں کی ترتیب کے اندر رمزی صورت میں (Coded) ریکارڈ کر لی جاتی ہے، جو اس سالمے کو وجود بخشتی ہے۔ ان بنیادوں کو اے، ٹی، جی اور سی، ان کے ناموں کے ابتدائی حروف کے لحاظ سے پکارا جاتا ہے۔ ان حروف کی ترتیب میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق لوگوں کی جسمانی ساخت میں ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۳.۵ بلین نیوکلیوٹائیڈ (Nucleotides) ہوتے ہیں یعنی ایک ڈی این اے سالمے میں ۳.۵ بلین حروف ہوتے ہیں۔

ڈی این اے سالمہ اپنے
دوہرے پیچیدار ساختیاتی
جسم کے ساتھ

ڈی این اے کا ایک خاص عضو یا لحمیہ ان خصوصی عناصر ترکیبی میں شامل ہوتا ہے جن کو ''جین'' (Genes) کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ سے متعلق معلومات خصوصی جینز کے ایک پورے سلسلے میں پائی جاتی ہیں جبکہ قلب سے متعلق معلومات ایک دوسرے جینز کے سلسلے میں پائی جاتی ہے۔ خلیے میں لحمیے کی پیداوار ان جینز میں شامل معلومات کو استعمال کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ وہ امینو ترشے جو ایک لحمیے کی ساخت کو ترکیب دیتے ہیں انہیں ڈی این اے میں موجود تین نیوکلیوٹائیڈز (Nucleotides) کی ترتیب و تنظیم سے واضح کیا جاتا ہے۔

اس مقام پر ایک اور اہم تفصیل توجہ طلب نظر آتی ہے۔ اگر ان نیوکلیوٹائیڈز کی ترتیب میں غلطی سرزد ہو جائے، جو ایک جین بناتے ہیں تو اس سے جین مکمل طور پر بیکار ہو جائے گا۔ جب یہ تصور کر لیا جائے کہ انسانی جسم میں ۲۰۰ ہزار جین ہیں تو یہ بات اور زیادہ عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کئی ملین نیوکلیوٹائیڈز کے لئے کس قدر ناممکن ہو جاتا ہے، جو یہ جین بناتے ہیں کہ وہ صحیح ترتیب میں اتفاقاً متشکل ہو جائیں۔ ایک ارتقاء پسند ماہر حیاتیات فرنک سیلسبری (Frank Salisbury) اس ناممکنہ بات پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

ایک درمیانے لحمیے میں ۱۳۰۰ امینو ترشے شامل ہو سکتے ہیں۔ ایک جین جو اسے کنٹرول کر رہا ہو اس کی زنجیر میں تقریباً ۱۰۰۰ نیوکلیوٹائیڈز ہو سکتے ہیں۔ ایک ڈی این اے زنجیر میں چونکہ چار قسم

کے نیوکلیوٹائیڈز ہوتے ہیں جن میں سے ایک میں ۱۰۰۰ کڑیاں ہوسکتی ہے، جو ۰۰۰لم شکلوں میں موجود ہوسکتا ہے۔

کسی قدر الجبرا (لوکارتھم: Logarithms) استعمال کر کے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ $۱۰^{۶۰۰}$ = ۰۰۰لم اگر ۱۰ کو ۸۰ سے ۶۰۰ مرتبہ ضرب دی جائے تو جو ہندسہ حاصل ہوگا وہ ہے ۱ جس کے بعد ۶۰۰ صفر آئیں گے۔ یہ تعداد ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

۰۰۰لم برابر ہے $۱۰^{۶۰۰}$ کے۔ یہ تعداد ا کے ساتھ ۶۰۰ صفر شامل کر کے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح ۱۰ کے ساتھ گیارہ صفر ہوں تو یہ ایک ٹریلین بن جائے گا۔ ایک ایسا ہندسہ جس کے ساتھ ۶۰۰ صفر آئیں بیشک ایک ایسی تعداد ہے جسے سمجھنا مشکل ہے۔

اس مسئلے پر ارتقاء پسند Prof. Ali Demirsoy درج ذیل اعتراف کے لئے مجبور تھا:

دراصل ایک لحمیے اور ایک نیوکلیائی ترشے (DNA, RNA) کا الل ٹپ متشکل ہو جانا بعید از امکان نظر آتا ہے اور بہت کم ادراک میں آسکتا ہے۔ تاہم ایک خاص لحمیاتی زنجیر کے وجود میں آجانے کے امکانات بے حد وسیع دکھائی دیتے ہیں۔

ان تمام عدم امکانات کے علاوہ ڈی این اے اپنی دوہری پیچیدہ زنجیری شکل کی وجہ سے کسی ردعمل میں بہت کم ملوث نظر آ سکتا ہے۔ اس سے بھی یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ یہ زندگی کی بنیاد ہوسکتی ہے۔

مزید یہ کہ ڈی این اے صرف کچھ خامروں کی مدد سے نقش ثانی بنا سکتے ہیں جو واقعی لحمیے ہوں اور ان خامروں کی ترکیب وتالیف صرف ڈی این اے میں بذریعہ کوڈ شامل شدہ معلومات سے ہوسکتی ہے۔ یہ دونوں چونکہ ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اس لئے یا تو انہیں بیک وقت نقش ثانی بنانے ہوتے ہیں یا ان میں سے ایک کو دوسرے سے قبل ''تخلیق'' کیا جانا ہوتا ہے۔ ایک امریکی ماہر خورد حیاتیات جیکب سن اس موضوع پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

منصوبوں کی تخلیق مکرر کے لئے مکمل ہدایات، توانائی، اور دستیاب ماحول میں کچھ حصوں کو علیحدہ کرنے، نشوونما اور بالیدگی، ترتیب اور موثر میکانکی عمل کے لئے کہ وہ ہدایات کو اس سمت منتقل کرسکیں جہاں سب کی بالیدگی کا سوال ہو، ان سب کو ساتھ ساتھ ایک وقت میں اس لمحے موجود ہونا چاہئے۔ (جب زندگی کی ابتداء ہوئی) واقعات کا یوں یکجا ہونا ناقابل یقین حد تک اتفاقیہ نظر آتا ہے اور اسے اکثر غیبی مداخلت کا نام دیا جاتا ہے۔

جیمز واٹسن اور فرانسس کرک نے جب ڈی این اے کی ساخت کے بارے میں انکشاف کیا تو اس کے دو برس بعد درج بالا حوالہ تحریر میں آیا تھا۔ مگر تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود یہ مسئلہ اِرتقاء پسندوں کے لئے لاینحل رہا۔ بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ ڈی این اے کے لئے تخلیق مکرر کی ضرورت، اس کے لئے کچھ لحمیات کی موجودگی کی ضرورت اور ڈی این اے میں موجود معلومات کے مطابق ان لحمیات کی تخلیق مکرر اِرتقاء پسندوں کے نظریے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔

دو جرمن سائنسدانوں جنکر اور شیرر (Junker and Sherer) نے اس کی وضاحت یوں کی کہ کیمیائی اِرتقاء کے لئے جن سالموں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ہر ایک کی تالیف و ترکیب جداگانہ حالات کی متقاضی ہوتی ہے اور اس سارے مواد کے ترکیب پانے کا امکان، جس کے لئے نظری طور پر مختلف اکتسابی طریقے ہوتے ہیں، صفر ہے:۔

اب تک کوئی بھی ایسا تجربہ ہمارے علم میں نہیں آیا جس میں ہمیں وہ تمام سالمے حاصل ہو سکیں جو کیمیائی اِرتقاء کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے بہت موزوں حالات کے تحت مختلف جگہوں میں بہت سے سالمے پیدا کرنا لازمی ہے اور پھر ان کو ردعمل کے لئے ایک دوسری جگہ لے جانا ضروری ہوگا اور اس سارے عمل میں انہیں آب پاشیدگی اور ضیانحزی حرکت (Photolysis) جیسے ضرر رساں عناصر سے محفوظ رکھنا ہوگا۔

مختصر یہ کہ نظریۂ اِرتقاء ان اِرتقائی مراحل میں سے کسی ایک کو بھی ثابت نہیں کر سکا جو سالمی سطح پر پیش آتے ہیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ امینو ترشے نہ ہی ان کی پیداوار یعنی لحمیات جو جانداروں کے خلیے بناتے ہیں کسی بھی متذکرہ "قدیم کرۂ ہوائی" میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ عناصر مثلاً ناقابل یقین حد تک پیچیدہ ساخت کے حامل لحمیات، دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے خدوخال اور "بپٹائڈ ملاپ" تشکیل دینے کی مشکلات اس استدلال کا ایک حصہ ہیں کہ وہ مستقبل کے کسی بھی تجربے میں کیوں پیدا نہ کئے جا سکیں گے۔

اگر ہم ایک لمحے کے لئے یہ بھی فرض کر لیں کہ لحمیات کسی طرح اتفاقاً وجود میں آجاتے ہیں اس کا بھی کچھ مطلب نہ ہوگا کیونکہ لحمیات اپنے طور پر کچھ بھی نہیں ہوتے: وہ از خود تخلیق مکرر نہیں کر سکتے۔ لحمیات کی ترکیب و تالیف تو صرف اس معلومات سے ہوتی ہے جو ڈی این اے اور آر این اے سالموں میں بذریعہ کوڈ پہنچائی جاتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ڈی این اے اور آر این اے کے بغیر

ایک لحمیہ تخلیق مکرر کر سکے۔

ان بیس امینو ترشوں کی وہ خاص ترتیب جو ڈی این اے میں کوڈ کی شکل میں پہنچائی جاتی ہے، انسانی جسم کے اندر ہر لحمیے کی ساخت کا تعین کرتی ہے۔ تاہم جیسا کہ ان تمام لوگوں کی طرف سے جنہوں نے ان سالموں کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ ڈی این اے اور آر این اے کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اتفاقاً متشکل ہو گئے ہوں۔

تخلیق کی حقیقت

ہر شعبے میں نظریۂ ارتقاء کی موت کے ساتھ، آج شعبہ خورد حیاتیات میں کئی ایسے مشہور نام ہے جو تخلیق کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے اس تصور کا دفاع شروع کر دیا ہے کہ ہر شے ایک خالق کی مرضی ومنشا سے ایک اعلیٰ وارفع تخلیق کے حصے کے طور پر تخلیق کی گئی ہے۔ یہ پہلے سے ہی ایک ایسی حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے سائنسدان جن کی اپنے کام تک کھلے ذہن کے ساتھ رسائی ہے، انہوں نے ایک ایسا نقطہ نظر اپنا لیا ہے جسے ''ذہانت آمیز نمونہ'' کہتے ہیں۔ نتیجہ اس قدر غیر مبہم اور اہم ہے کہ اسے تاریخ سائنس میں ایک اعلیٰ ترین کامیابی کے طور پر درجہ دیا جانا چاہئے۔ سائنس کی یہ کامیابی دس ہزار لوگوں کے حلق سے ''اور یکا'' (پالیا یا مل گیا، جو ارشمیدلیس کا نعرۂ مسرت تھا) کے نعرۂ مسرت کی آوازیں بلند کرے گی۔

مگر نہ تو کسی بوتل کا کارک کھلا ہے نہ ہی کہیں سے تالیاں بجنے کی آواز سنائی دی ہے۔ اس کے برعکس ایک متجسس پریشان کن خاموشی نے خلیے کی بے لچک پیچیدگی کو گھیر رکھا ہے۔ جب یہ موضوع عام لوگوں تک پہنچتا ہے، پاؤں زمین پر تیز حرکت میں آجاتے ہیں، سانس معمول سے ہٹ کر مشکل سے آنا شروع ہو جاتا ہے، نجی سطح پر لوگ قدرے مطمئن ہو جاتے ہیں، بہت سے ظاہری صورت حال کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اپنے سروں کو جنبش دیتے ہیں اور جو ہو رہا ہے اسے ہونے دیتے ہیں۔ سائنسی برادری اپنی حیرت انگیز دریافت کو حریصانہ گلے سے کیوں نہیں لگاتی؟ نمونے کے مشاہدے کو ذہانت کے دستانوں سے کیوں کنٹرول کیا جاتا ہے؟ مخمصہ یہ ہے کہ ہاتھی کے ایک طرف ''ذہانت آمیز نمونہ'' کا لیبل لگا ہوا ہے تو دوسری طرف ''خدا'' کا لیبل لگنا چاہئے۔

آج بہت سے لوگ تو اس بات سے بھی باخبر نہیں ہیں کہ وہ سائنس کے نام پر بجائے اللہ پر یقین کرنے کے، مغالطے کے ایک وجود کو سچ کے طور پر تسلیم کرنے لگ گئے ہیں۔ وہ جنہیں یہ جملہ

نہیں ملتا'' اللہ نے تمہیں عدم سے تخلیق کیا''، وہ سائنسی طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اوّلین جاندار ان بجلی کے کڑکوں سے وجود میں آیا تھا جو کئی بلین برس قبل "Primordial soup" (بنیادی نائٹروگلیسرین) سے ٹکرائے تھے۔

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے کسی اور حصے میں اس بات کا ذکر کیا ہے فطرت یا 'نیچر' (Nature) میں توازنات اس قدر نازک اور نپے تلے ہیں اور تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ''اتفاقاً'' وجود میں آ گئے تھے عقل ودانش کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔ خواہ ان لوگوں کی تعداد کچھ بھی ہو جو اس غیر دانشمندانہ بات سے دور رہ سکتے ہیں آسمانوں اور زمین میں اللہ کی نشانیاں پوری طرح عیاں ہیں اور ان سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اللہ آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان موجود ہر شے کا خالق ہے۔ اس کی ہستی کی موجودگی کی نشانیوں نے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔

وہ فلسفے جن سے اللہ کی ذات سے انکار کی غلطی سرزد ہوئی

گزشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا کہ وجود باری تعالیٰ کی واضح و روشن نشانیاں موجود ہیں۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ اس کے لامحدود ثبوت کا صرف ایک حصہ ہے۔ کوئی جس سمت بھی رُخ کرے اُسے خالق کائنات کی موجودگی کی نشانیاں نظر آئیں گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اب تک دنیا میں اتنی بڑی تعداد میں ملحدین کیوں ہیں؟ مزید یہ کہ کچھ سائنسدان اب تک ملحد کیوں ہیں؟ اس قدر عیاں اور روشن نشانیوں کی موجودگی میں وہ اللہ کے وجود سے اب بھی کیوں انکار کرتے ہیں؟

جب ہم ان سوالات کے جوابات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں کئی فلسفیانہ تعصبات نظر آتے ہیں جو کفر و الحاد کا عقیدہ تشکیل کرتے ہیں، ان میں ملحد سائنسدان بھی شامل ہے۔ اسے عموماً مادہ پرستی کا نام دیا جاتا ہے۔ فلسفیانہ نظریے کے مطابق یہ کائنات دائمی ہے اور اس کے قائم رہنے کے لئے کسی خالق کی ضرورت نہیں ہے۔ ان مادہ پرستوں کے خیال میں مادہ ہی وہ واحد قوت ہے جو موجود ہے مادہ کسی نے تخلیق نہیں کیا اور یہ بغیر کسی کے کنٹرول کے کام کرتا ہے جس میں کسی خالق کی مداخلت شامل نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ایسے بیشمار فلسفی ہیں جو یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا تعلق قدیم بابل کے سمیریوں کے لامذہب عقائد سے تھا اور کچھ قدیم یونان کے وہ فلسفی تھے جو جوہریت پر یقین رکھتے تھے۔ جدید دور کے استدلالی مادہ پرستوں نے اس نظریے کی قوت کی بنیاد پر اللہ کے وجود سے انکار کیا ہے۔

ان کے انکار کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔ انہوں نے صرف اپنے آپ کو یقین دلایا ہے کہ مادہ دوام رکھتا ہے اور اس عقیدے پر وہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ انہوں نے نظریۂ ارتقاء پر اسی

استدلال سے یقین کر کے اور اسے اپنے عقیدے کے طور پر اپنا لیا ہے۔ ایک مشہور امریکی ماہر خورد حیاتیات Michael Behe کو اس وقت یہ خیال آیا جب اسے اس کا احساس ہوا کہ زندگی اس قدر جامع و پیچیدہ ہے کہ اتفاقاً کبھی بھی وجود میں نہیں آ سکتی تھی، چنانچہ وہ صرف خاموش رہ سکتے ہیں اور اس موضوع کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ ایسے تعصبات موجود ہیں جو ان لوگوں کو مادہ پرستی کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور اس کا قدرتی نتیجہ الحاد کی شکل میں نکلتا ہے۔ ان کا اللہ کے وجود سے انکار ایک معروضی نقطہ نظر کے ٹھوس حقائق کی جانچ پڑتال کے نتیجے میں نہیں ہے بلکہ وہ تو ان ٹھوس حقائق کے باوجود ایسا کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ وہ اپنے انکار کو عام لوگوں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔

”شر انگیز سازشوں“ کے تخلیق کار

اللہ پر یقین و ایمان کے خلاف ایک منظم پروپیگنڈا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تحریکیں مخصوص مراکز سے شروع ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قوت و طاقت کے بہت سے مراکز ہوتے ہیں جو لوگوں کے مذہبی اعتقادات کو کمزور کرنے اور توڑنے کے لئے پوری پوری کوششیں کرتے ہیں۔ اللہ نے قرآن حکیم میں ان گروہوں کی جانب متوجہ فرمایا ہے۔ ایک سورۃ میں لوگوں کے اس گروہ کا ذکر ہے جنھیں آخرت میں جہنم کی آگ میں سزا کے طور پر جھونک دیا جائے گا، وہ اپنے ان رہنماؤں کو پکاریں گے جنھوں نے دنیا میں ان کو گمراہ کیا تھا اور کہیں گے:

بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا۔

”نہیں بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں۔ (سورۃ سبا: ۳۳)

یہ گروہ جو دوسروں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اللہ سے کفر کریں اور شر انگیز سازشیں تیار کرتے ہیں، تاریخ کے ہر دور میں مختلف ناموں اور مختلف روپ دھار کر موجود رہے ہیں۔ ان کی بنیادی خصلتیں کم و بیش ہمیشہ ایک سی رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو ”عیاشوں“ (سورۃ المومنون: ۶۴) کے نام سے یا ”برائی کے مدعیوں“ (سورۃ الاعراف: ۷۵) کے نام سے پکارا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ مادی لحاظ سے بہت خوشحال اور مراعات یافتہ ہوتے ہیں، جن

کو معاشرے میں بڑی عزت دی جاتی ہے اور جو اپنے مال و دولت اور املاک کی وجہ سے نخوت و کبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے ظلم و ناانصافی سے جو مراعات چھین رکھی ہوتی ہیں، مذہب چونکہ ان کے لئے ایک خطرہ ہوتا ہے اس لئے وہ مذہب کو ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''شرانگیز سازشیں'' تیار کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کر سکیں۔

بیشک اس قسم کی منظم قوتوں کی کوئی ایک تشریح نہیں ہو سکتی۔ وہ مختلف معاشروں میں مختلف شناختوں اور شکلوں کو اختیار کر کے زندگی گزارتے ہیں تاہم جب تاریخ میں پچھلی تین چار صدیوں پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں ایک عالمی تنظیم ایسی نظر آتی ہے جو قرآن میں بیان کی گئی توصیف کے عین مطابق نظر آتی ہے۔

اس تنظیم کا نام ہے فری میسنری۔

اس مقام پر ہمیں اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ دنیا بھر میں جو کوشش فری میسنری کر رہی ہے اسے ایک قوت و طاقت کے مرکز کی تائید و حمایت حاصل ہے، جس کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے: قوم یہود۔ حالانکہ یہودیت ایک ربانی مذہب ہے اور یہودی اس مذہب کے ماننے والے ہیں مگر انہوں نے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں دنیا بھر میں مذہب کے خلاف پروپیگنڈے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خاص طور پر عہد نامہ قدیم میں یہودی عالموں کی طرف سے کی گئی یکطرفہ تبدیلی کی وجہ سے ہے۔ اور پیغمبر خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس پاک و خالص مذہب کا اعلان کیا تھا اس میں در پردہ توہم پرستانہ عقائد کے شامل کر دیئے جانے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ یہودی علماء نے جب اس ربانی مذہب میں تبدیلیاں کر کے اِسے ربانی مذہب نہ رہنے دیا تو یہودیت ایک دنیاوی اور شاونی (Chauvinist) نظریہ بن کر رہ گئی تھی۔ بالآخر کئی قدامت پسند یہودی جو اس مذہب کو اپنے لئے ایک نظریہ تصوّر کرتے تھے، اب یہ کہنے لگے ہیں کہ عیسائیت اور اسلام ''جھوٹے مذاہب'' ہیں جن کو منسوخ کر دیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ دلچسپ باہمی اثر و نفوذ مذکورہ لوگوں کو ایسی قوتوں کے طور پر جدوجہد پر اکساتا ہے جو دنیا سے مذہبی اعتقادات کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ صیہونیت اور فری میسنری کے درمیان الحاق کے لئے یہ ایک منطقی بات نظر آتی ہے۔

فری میسنری کا کردار

یہ خفیہ تنظیم جس کی جڑیں مغربی دنیا میں ہیں جہاں سے یہ بعدازاں دنیا بھر میں پھیلتی گئی، ہمیشہ سے ہر اس ملک میں جہاں یہ سرایت کر سکی مذہب دشمن فکر اور سرگرمی کا منبع رہی ہے۔

پچھلی دو صدیوں میں دنیا کے جس ملک میں بھی مذہب کے خلاف جنگ لڑی گئی اس کا قریبی جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس قسم کی کوششوں میں فری میسنری ہمیشہ مرکز میں رہی ہے۔ اس معاملے میں تاریخ یورپ واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیتھولک دنیا کے رہنما پوپ لیو XIII نے اپنے مشہور گشتی مراسلے (۱۸۸۴) Humanum Genus میں بطور خاص میسنری کو نشانہ بنایا تھا۔ پوپ اس تنظیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہمارے عہد میں ایک ایسی تنظیم کی اعانت وحمایت سے، جسے فری میسنری کہتے ہیں اور جو ایک وسیع اور مضبوط تنظیم ہے، ان کی کوششیں یکجا ہوگئی ہیں جو تاریک طاقتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ تو اَب خدا کے خلاف جنگ کرنے میں اپنی بدنیتی کو چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس تنظیم میں شامل افراد کے عزائم اور کوششیں صرف ایک مقصد کے لئے ہیں: ''عیسائیت کے تمام سماجی اور مذہبی شعبوں کو منسوخ کر کے ایک ایسے قوانین پر مشتمل نظام کو رواج دینا جس کی بنیاد نیچریت کے اصولوں اور ان کے اپنے افکار پر ہو''۔

یہ پاپائی تجزیہ جو ۱۹ویں صدی کے اختتام پر پیش کیا گیا تھا حرف بحرف درست ہے۔ جب ہم معاصر میسنری مطبوعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس تنظیم کا بنیادی مقصد معاشرے سے تمام مذہبی اعتقادات کو منسوخ کر دینا ہے۔ ایک ترک میسنری نے اپنے ایک پمفلٹ میں یہ اعلان کیا کہ مذہب کو کس طرح ''معاشرے کے مثبت علوم کو ختم کر کے'' منسوخ کیا جائے گا۔

میں آخر میں یہ کہنا چاہوں گا:

نہایت انسانی اور میسنری مشن جو ہمارے ذمے ہے وہ سائنس اور استدلال سے برگشتہ کرنا اور اسے اس خیال سے پھیلانا نہیں ہے کہ اِرتقاء کا یہی بہترین اور واحد طریقہ ہے بلکہ عوام کو مثبت سائنسز (Positive Sciences) ہی سکھانا ہے۔ Ernest Ranan کے درج ذیل الفاظ بڑے قابل غور ہیں: ''اگر عوام کو مثبت سائنسز اور استدلال سکھا دیا جائے تو مذاہب کے

کھو کھلے عقائد بالآخر موقوف ہو جائیں گے''۔

یہاں جو کچھ ''مثبت سائنس'' سے مراد ہے وہ لازمی طور پر ''مثبت سائنس'' ہے یعنی وہ مادہ پرستانہ فلسفہ جو اس شے کا انکار کر دیتا ہے جسے تجربے اور مشاہدے سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ دوسری طرف فری میسنری کا مشن اس فلسفے کو ''سائنس'' کے نام پر لوگوں پر مسلط کرنا ہے تاکہ اس طرح تمام مذہبی اعتقادات کو منسوخ کیا جا سکے۔ عقائد کی اس مہم میں نظریۂ ارتقاء کو ایک نہایت نازک کردار ادا کرنا ہوتا ہے جیسا کہ درج بالا اقتباس وحوالے میں بھی اسے واضح کر دیا گیا ہے۔ فری میسنری کا دعویٰ ہے کہ معاشرے میں ارتقاء کے نظریے کو عام کرنا اس کا سب سے مقدم کام ہے۔

یہ تنظیمی رابطہ اس استدلال کی تہ میں ایک اہم عنصر کے طور پر کارفرما ہے کہ نظریۂ ارتقاء اور مادہ پرستانہ فلسفہ دونوں اور اس کے ماخذ اس قدر تندہی سے دنیا کے کونے کونے میں کیوں پھیلائے جا رہے ہیں۔ فری میسنری کی تنظیم اور اس کی شاخیں اس منظم پروپیگنڈے میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں جو گزشتہ دو سو سال سے مذہبی عقائد کے خلاف پھیلایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن مختلف اور بعض اوقات متضاد فلسفیانہ نظاموں کے بانیوں نے اللہ کے وجود سے انکار کیا وہ سب کے سب میسنری تھے۔

فری میسن فلسفے

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، خلاف مذہب فلسفیانہ نظاموں کے بانی دراصل اس باضابطہ جنگ کا حصہ ہیں جو مذہب کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہ کیوں دریافت کیا ہے کہ زیادہ تر فلسفی فری میسنری تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے ان نظاموں کی بنیاد رکھی ہے اور مذہب کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے بالکل مرکز میں یہی تنظیم کھڑی ہے۔

اس ضمن میں وہ فلسفی جنہوں نے فوری توجہ مبذول کرائی ان کا تعلق فرانسیسی دانشوروں سے تھا، جو فرانسیسی انقلاب کے پیشرو تھے۔ ان لوگوں نے نہ صرف مذہبی علماء کو تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ مذہب کے خلاف تشدد آمیز معاندانہ رویہ عام کیا۔ ان میں Diderot شامل تھا جو ''نیچر کا نظام'' (The System of Nature) کا مصنف تھا، اس کتاب کو ''مادہ پرستی کی بائبل (Bible of Materialism)'' کہا جاتا ہے۔ دوسرا نام وولیٹر کا آیا ہے جو سرگرم مادہ پرست اور مذہب دشمن

تھا۔ پھر انقلابی مادہ پرستوں Montesquieu اور Jean Jacques Rousseau کے نام آتے ہیں۔ انہوں نے ایک نئے "مذہب" کی بنیاد رکھی اور ان میں قاموس نگار (Encyclopaediasts) بھی شامل تھے یہ سب کے سب سرگرم مخالفین مذہب تھے۔ ترک میسنریوں کا جریدہ Mimar Sinan ان افراد کے بارے میں لکھتا ہے:

ایک میسنری نظریات دان نے ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس تیار کیا تھا۔ انسانی حقوق کا اعلامیہ جو آزادی، مساوات اور اخوت و بھائی چارے کے اصولوں کو گلے سے لگاتا ہے وہ ہمارے جن ماہرین کی رہنمائی اور تحریک پر لکھا گیا ان میں Montesquieu، وولیٹر، روسو اور Diderot شامل تھے۔

"میسن جریدہ" (Mason Magazine) جسے ترک میسنز (Masons) نے شائع کیا، لکھتا ہے:

فرانس میں جاگیرداری نظام کا تختہ الٹ دینے میں جو افراد پیش پیش تھے اور جنہوں نے عظیم انقلاب فرانس برپا کیا ان میں Montesquieu، وولیٹر، جے جے رُوسو، رہنما مادہ پرست Diderot اور "قاموس نگار" (Encyclopaediasts) شامل تھے۔ یہ سب کے سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ تمام میسن (Masons) تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد کے برسوں میں جو مادہ پرستانہ اور خلاف مذہب تصوّرات تیزی سے پھیلے وہ انیسویں صدی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ ہم جب اس تحریک کے رہنماؤں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک بار اور فری میسنری تنظیم نظر آتی ہے۔

مزید یہ کہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان افراد میں زیادہ یہودی تھے۔ اس سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ یہودیوں نے میسنریوں کے ساتھ مل کر ربانی مذہب مثلاً عیسائیت اور اسلام کو کمزور کرنے کی کوشش کی اور فلسفیانہ بنیادوں پر مادہ پرستانہ عالمی تصوّر کو اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے اہم جانا۔

مظاہرات اشتراکیت کی پشت پر

جنوبی جرمنی میں ۱۷۷۶ء میں بویریا (Bavaria) کے مقام پر چند نکی افراد پر مشتمل ایک گروہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس گروہ کا بانی Adam Weishaupt جو خود قانون کا پروفیسر تھا، اسے

"روشن ضمیروں" کا گروہ کہتا تھا۔ یہ سوسائٹی دو پہلوؤں سے دلچسپ تھی: اولاً یہ ایک خفیہ سوسائٹی تھی اور اس کے پیش نظر اعزاز و برتری کے حصول کا ایک بے تابی سے بھرپور سیاسی پروگرام تھا۔ اس پروگرام کو قلمبند کرنے کا کام Weishaupt نے کیا تھا۔ اس سوسائٹی کے دو بنیادی مقاصد یہ تھے:

۱۔ بادشاہتوں کا خاتمہ اور کسی نظام کے تحت چلنے والی حکومتوں کا قیام۔

۲۔ تمام ربانی مذاہب کی تنسیخ۔

اس سوسائٹی کا مذہب کے بارے میں رویہ بڑا معاندانہ تھا۔ انگریز مؤرخ مائیکل ہاورڈ کے خیال میں Weishaupt کسی بھی قسم کے ربانی مذہب سے "مرضیاتی نفرت" رکھتا تھا۔

دراصل مذکورہ سوسائٹی ایک طرح کا میسنری گھر تھا۔ Weishaupt ایک سینئر فری میسن تھا جس نے اسے میسنری گھروں کے روایتی تنظیمی خطوط پر قائم کیا تھا۔ ۱۷۸۰ء میں جرمن میسنری گھروں کے عظیم رہنماؤں میں سے Baron Von Knigge کی شرکت سے روشن ضمیری میں حیرت انگیز حد تک تیزی سے اضافہ ہوا تھا اور سوسائٹی کی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ جرمنی میں جو برائے نام اشتراکی ملک تھا، انقلاب کے لئے Weishaupt اور Knigge ابتدائی کام کر رہے تھے۔ جب حکومت کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کیا کرنے جا رہے ہیں تو ان دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ سوسائٹی کو توڑ دیں۔ اس کی سرگرمیاں اب ان کے باقاعدہ فری میسنری گھروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ اتحاد ۱۷۸۲ء میں قائم ہوا تھا۔

۱۸۰۰ء کی ابتدائی دہائی میں جرمنی میں ایک نئی سوسائٹی قائم ہوئی جس نے روشن ضمیری کی روایت کو جرمنی میں جاری رکھنے کا عزم دکھایا تھا۔ سوسائٹی کا نام "دیانتداروں کی سوسائٹی" (Society of the Honest one) تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کا نام تبدیل کر کے "اشتراکیوں کی سوسائٹی" (Society of Communists) رکھ دیا گیا تھا۔ اس سوسائٹی کا سربراہ اپنے گروہ کے لئے ایک سیاسی پروگرام تشکیل دینا چاہتا تھا پہلے دو افراد جن کے ذمے اس پروگرام کو تحریر میں لانا تھا وہ کٹر اشتراکی دانشور کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز تھے۔ اشتراکیوں کی سوسائٹی کی ہدایت پر ان دونوں نے اشتراکی منشور لکھا۔ اس منشور کا ایک معروف قول یہ تھا کہ مذہب "لوگوں کے لئے افیون" ہے اور منشور کے کتابچے میں اس بات پر بحث کی گئی تھی کہ مذہبی اعتقادات کو ختم کرنا اس معاشرے کے لئے ضروری تھا جہاں کوئی طبقاتی درجہ بندی نہ ہو۔ اور اس کو انسانیت کے لئے نجات کی واحد امید تصور کیا گیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کارل مارکس اور

اینجلز دونوں یہودی النسل تھے۔

اسی اشتراکی تحریک میں میسنریوں اور یہودیوں کی بالادستی آنے والے کئی برسوں تک قائم رہی۔ چند ایک ایسے میسنری اور یہودی جنہوں نے اس اشتراکی تحریک کو پھیلانے میں مدد دی، یہ تھے:

Ferdinand Lassalle: وہ مارکس کا بہترین دوست تھا۔ اس نے ایک انقلابی اشتراکی آمریت کے تصور کا دفاع کیا۔

وکٹر ایڈلر: وہ اینجلز کا دست راست تھا۔ اس نے اشتراکیت کے فروغ کے لئے بڑی کوشش کی۔ اس کا بیٹا Friederich Adler آسٹریائی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بن گیا تھا۔

Moses Hess: وہ ایک قدیم خیالات کے حامل یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک اشتراکی اور مارکس کا دوست تھا۔ وہ ایک کٹر صیہونی بھی تھا۔ اس نے اپنی کتاب "روم اور یروشلم" (Rome & Jerusalem) میں یورپ میں صیہونی تحریک کو عام کرنے کا آغاز کیا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم ہو جائے۔ وہ عمر بھر ڈارونیت کے سرگرم محافظوں میں سے رہا تھا۔

Gyorgy Lukacs: وہ ایک متمول یہودی خاندان کا رکن تھا۔ اس نے اشتراکیت کی حمایت میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ اس نے نوجوانوں میں اشتراکی نظریے کو عام کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ ہنگری میں جب اشتراکیت برسر اقتدار آئی تو اس انقلاب میں یہ پیش پیش تھا۔

Vladimir.I.Linen: روس میں بالشویک تحریک کے دوسرے لیڈروں میں سے ایک یہودی لیڈر یہ بھی تھا۔ لینن دنیا بھر میں ایک نہایت خونی مطلق العنان حکومت کا بانی تھا۔

Herbert Marcuse: وہ ایک یہودی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے مارکسیت کی از سر نو تشریح کی اور ۱۹۶۸ء کے طلبہ کی طرف سے برپا کئے جانے والے انقلاب کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ اس نے بائیں بازو کی کالجوں کی تحریکوں کو ہوا دی جو دنیا بھر میں پھیل چکی تھیں اور ایک ایسا حکومت دشمن نظریہ تشکیل دیا جس نے نوجوانوں کو لقمہ اجل بنایا اور آج بھی بہت سے نوجوانوں کی موت کا باعث بن رہا ہے۔

ایک فلسفہ اور اس کا پوشیدہ ایجنڈا

جب ہم فلسفے کی تاریخ پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے یہودی ملحد اور مذہب دشمن فلسفی ہیں جو میسنری شناخت کی بنیاد پر معروف ہیں۔ ان میں درج ذیل مفکرین کے نام آتے ہیں:

ہیوم، Holbach، شیلنگ، جان سٹیورٹ مل Auguste Comte، Marquis de Sade، اور ماہرین عمرانیات میں Emile Durkheim، Ferdinand Tonnies، ہربرٹ سپنسر، سگمنڈ فرائیڈ، ہنری برگساں اور Erich Fromm کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کے سب یہودی النسل ہیں اور سبھی نے لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی تاکہ ایک ایسا سماجی و اخلاقی نظام قائم کرسکیں جو پوری طرح بے دین وملحدانہ بنیادوں پر استوار ہوا ہو۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان افراد میں چارلس ڈارون اور اس کے نظریات ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفے جنہوں نے ان مفکرین اور ان جیسے دوسرے ہزاروں افراد کو جنم دیا ان کے کچھ مخصوص سیاسی وسماجی مفادات تھے۔ جیسا کہ ہم شروع میں یہ کہہ چکے ہیں کہ زیادہ لوگ اللہ کا انکار اس وجہ سے کرتے ہیں کیونکہ وہ مذہب سے مطمئن نہیں ہوتے اور مذہب اللہ پر یقین وعقیدے کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ مذہب کی سچائی سے اس لئے انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے مفادات سے یا ان حلقوں سے متصادم ہوتی ہے جن کی یہ نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنے لئے حمایت حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ کفر والحاد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس وجہ سے اللہ کی موجودگی کی روشن نشانیاں ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ یا یہ کہ وہ ان نشانیوں کو دیکھنے کی خواہش ہی نہیں رکھتے۔ یہ اللہ پر یقین و ایمان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اسی عدم یقین اور کفر کو معاشرے کے عام لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔ آخرکار ایسے لوگ سامنے آتے ہیں جو یا تو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے یا انہوں نے رب کائنات کو بھلا دیا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ توبہ میں اس کا ذکر آیا ہے:

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ۔

"یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا"۔(سورۃ التوبہ:٦٧)

یہی وجہ ہے کہ زیادہ لوگ عمر بھر اللہ کی تعریف نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس بات کی آزادی رکھتے ہیں کہ اس کی تعریف کریں یا نہ کریں۔مگر کسی شخص کو اس "بیکار اکثریت" سے دھوکہ نہ کھا جانا چاہئے۔اسی موضوع پر قرآن حکیم کی درج ذیل سورۃ ہمیں خبردار کرتی ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔

"اور اے نبیؐ اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں"۔(سورۃ الانعام:١١٦)

(تفصیل جاننے کیلئے ہارون یحییٰ کی کتاب "نیا میسنری نظام" (New Masonic Order) کا مطالعہ کیجئے)۔

منکر خدا تقلیدی نمونے کے حامل معاشرے کے نقصانات

اللہ رب العزت قرآن حکیم کی درج ذیل سورۃ میں بیان فرماتا ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو ایک خاص فطری موزونیت کے ساتھ پیدا کیا:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ

''پس (اے نبیؐ اور نبیؐ کے پیروو) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے''۔ (سورۃ الروم: ۳۰)

بنی نوع انسان کی فطری موزونیت کا انحصار اللہ کا خدمت گزار بندہ بن کر رہنے اور اس پر ایمان لانے پر ہے۔ انسان چونکہ اپنی لامحدود خواہشات اور ضروریات کو خود پورا نہیں کر سکتا، اسے قدرتی طور پر اللہ کے حضور عجز وانکساری سے جھکنے اور اسی کی جانب رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اگر انسان اپنی اس فطری موزونیت کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اسے سچا اعتماد، اطمینان و سکون، خوشی و مسرت ملتی ہے اور تباہی و بربادی کے خطرے سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس فطری موزونیت سے انکار کر دیتا ہے اور اللہ سے منہ موڑ لیتا ہے تو پھر وہ پوری زندگی پریشانی، خوف، فکر و اندیشے اور رنج و الم میں گزارتا ہے۔

یہ قانون جو انسان کے لئے درست ہے معاشروں کے لئے بھی درست ہے اگر کوئی معاشرہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ معاشرہ ایک عدل و انصاف، امن و سکون، خوشی و مسرت اور عقلمندی و دانائی کا حامل معاشرہ بن جاتا ہے۔ اور اگر اس کے برعکس ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یعنی اگر کوئی معاشرہ اللہ سے بے خبر ہو تو پھر ایسے معاشرے میں بسنے والے لوگوں کا نظام

تباہ ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بدعنوان اور غیر مہذب ہوں گے۔ جب ہم ان معاشروں کا جائزہ لیتے ہیں جنھوں نے اللہ سے روگردانی کی ہے تو یہ حقیقت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ملحدانہ فکر کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اخلاقیات کا تصوّر اور مکمل طور پر بدعنوان معاشروں کی ترقی تباہ ہو جاتی ہے۔ مذہبی اور اخلاقی حدود کو پھلانگنے اور صرف انسانی خواہشات کی تسلی کا خیال رکھنے والا کلچر اس لفظ کی روح کے تناظر میں ظلم وستم ڈھانے والا نظام ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے نظام میں ہر طرح کی پستی اور ابتذال، جنسی گمراہی سے لے کر منشیات کے عادی ہو جانے تک کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

اس کے نتیجے میں ایسے معاشرے وجود میں آتے ہیں جو انسانی محبت سے عاری ہوں اور جو خود پسند، جاہل، سطحی اور بیہودہ تصوّر ہوتے ہوں۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں لوگ صرف اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے زندہ ہوں، اس میں امن، محبت اور دوستی کو برقرار رکھنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ ایسے معاشرے میں انسانی رشتوں کا انحصار باہمی مفادات پر ہوتا ہے۔ ان میں انتہائی بداعتمادی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جب ایک فرد کے لئے مخلص، دیانتدار، قابل اعتماد یا خوش اخلاق رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا تو پھر ایک دوسرے سے دُوری، جھوٹ، دھوکہ وفریب کے راستے میں کوئی شے رکاوٹ نہیں بنتی۔ ان معاشروں کے لوگوں نے ''اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے'' (سورۃ ہود:۹۲) اور یوں انہوں نے کبھی بھی اللہ کے خوف کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ لوگ چونکہ اللہ کے بارے میں ''صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے''، اسی لئے وہ یوم حساب کو بھولے بیٹھے ہیں۔ ان کے نزدیک جہنم مذہبی کتابوں میں آنے والے ایک لفظ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ اس دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے جو گناہ ان سے سرزد ہوئے، موت کے بعد انہیں اللہ کے سامنے اس کا حساب دینا ہوگا یا یہ کہ وہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بن سکتے ہیں۔ اگر وہ اس بارے میں سوچتے بھی ہیں تو وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگت کر ''وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے''۔ اس بارے میں قرآن حکیم کی اس سورۃ میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۔

''ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہمیں ملے گی بھی تو بس چند روز''۔ ان کے خودساختہ عقیدوں نے ان کو

اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے"۔ (سورۃ آل عمران: ۲۴)

پس یہ لوگ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی تسکین کی کوشش میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ یہ صورت حال قدرتی طور پر اس اخلاقی پستی کو جنم دیتی ہے جو آج ہمیں مختلف معاشروں میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے استدلال کی روشنی میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ "چونکہ میں اس دنیا میں ایک ہی بار آیا ہوں اور مجھے ۶۰-۵۰ برس زندہ رہنا ہے تب مجھے موت آئے گی، تو کیوں نہ میں یہاں عیش کر لوں"۔ اس غلط استدلال کے نتیجے میں جو خیال اس شخص کو آیا اس سے ہر طرح کی ناانصافی، جسم فروشی، چوری وڈاکہ زنی، جرائم اور اخلاقی گراوٹ کو راستہ ملے گا۔ ایک شخص تمام قسم کے جرائم، قتل انسانی یا دھوکہ وفریب میں ملوث ہو سکتا ہے جب ہر فرد سوائے دنیاوی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے کچھ اور سوچتا ہی نہیں تو پھر ہر دوسرا فرد بشمول اس کے خاندان اور دوستوں کے اسے ثانوی اہمیت دینے لگتا ہے۔ دوسرے افراد کی اس معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

ایک ایسے سماجی ڈھانچے میں، جو کافی حد تک مفاد کے رشتوں کے سہارے کھڑا ہوتا ہے لوگوں کی باہمی عدم اعتماد کی کیفیت سماجی اور انفرادی دونوں سطح پر امن کے قیام میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ مستقلاً شک وشبے، تذبذب اور بے چینی و بے کلی کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں کوئی نہیں جانتا کہ کس سے، کب اور کیسے عداوت ودشمنی کا ارتکاب ہو جائے گا۔ لوگ اس صورت حال میں روحانی طور پر خوف اور پریشانی کا شکار رہتے ہیں۔ عام بداعتمادی اور شک وشبہ انہیں خوشی ومسرت سے محروم زندگیاں گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں تمام قسم کی اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دیا جائے تو خاندان، دیانتداری اور عفت و پاکدامنی سے متعلق لوگوں کا نظریہ بڑا تشویشناک ہوتا ہے کیونکہ انہیں اللہ کا خوف نہیں رہتا۔

اس قسم کے معاشروں میں لوگوں کی زندگی باہمی محبت و احترام پر بھروسہ نہیں کرتی۔ معاشرے کے اراکین ایک دوسرے کا احترام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بغیر کسی وجہ کے وہ ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے رویے کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ دراصل وہ اس قسم کا رویہ اپنانے میں اپنے لاعلمی پر مبنی استدلال کے اندر حق بجانب ہوتے ہیں۔ انہیں زندگی بھر یہ سکھایا جاتا رہا کہ وہ عمل تغیر کے ذریعے جانوروں سے انسانی شکل میں آئے ہیں اور موت پر ان کی روحیں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔ اس لئے بندر سے انسانی شکل میں آنے والے اس جسم کا

احترام یہ ضروری نہیں سمجھتے جسے تہ خاک گل سڑ جانا ہے اور جسے وہ دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔
اپنے اس غلط استدلال میں کہ ''ان ہی کی مانند تمام دوسرے انسانوں کو ایک روز مرنا ہے جو زمین میں دفن ہو جائیں گے، ان کے جسم مٹی میں مٹی ہو جائیں گے اور ان کی روحیں غائب ہو جائیں گی۔ اس صورت حال میں انہیں کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے پیش آنے کی فکر کریں اور خود قربانی دیں؟'' بیشک یہ وہ خیالات ہیں جو ہر ایسے شخص کے لاشعور میں موجود ہوتے ہیں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا یا اسی وجہ سے آخرت پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ ایسے معاشروں میں جن میں اللہ پر ایمان نہیں ہوتا امن، خوشی و مسرت یا اعتماد کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

جو کچھ ہم نے کہا اس کا مطلب یہ تجویز کرنا نہیں ہے کہ ''اُن معاشروں میں بگاڑ شروع ہوتا ہے جن میں لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اس لئے وہاں اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے''۔ اللہ پر اس لئے ایمان لانا لازمی ہے کیونکہ اللہ موجود ہے اور جو کوئی اس کی ہستی کا انکار کر دیتا ہے وہ اس کے سامنے ایک گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم ان معاشروں پر توجہ دیں جن میں اللہ پر ایمان موجود نہیں ہوتا اور وہ بدعنوانی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہمارا سارا زور اس بات پر ہے کہ ان معاشروں کے اساسی نظریات غلط ہیں۔ غلط نظریات کے نتائج برے نکلتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس سے انکار خدا کا بہت بڑا گناہ سرزد ہوتا ہے اسے بدترین نتائج کا سامنا بہر صورت کرنا ہوتا ہے۔ ان نتائج پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معاشرہ کس قدر غلطی پر ہے۔

ان معاشروں کی مشترک خصوصیات یہ ہیں کہ وہ مجموعی طور پر فریب خوردہ ہوتے ہیں۔
جیسا کہ قرآن حکیم کی اس سورۃ میں ارشاد ہوا:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔

''اور اے نبیؐ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں'' (سورۃ الانعام: ۱۱۶)

زیادہ تر معاشروں میں ایک صفت قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے جو اس ''مجموعی'' نفسیات کو تخلیق کرتی ہے جو پہلے سے موجود انکار خدا میں اضافہ کرتی ہے۔ اللہ ان معاشروں کا ذکر

کرتا ہے جو اسے اور آخرت کو بھلائے ہوئے ہیں۔ قرآن میں انہیں "لاعلم" کہا گیا ہے۔ بیشک اس معاشرے کے افراد طبیعات، تاریخ، حیاتیات یا ایسی دوسری سائنسز پڑھ چکے ہوں گے مگر ان میں اللہ کی قوت اور طاقت کا اعتراف کرنے کے لئے عقل وشعور اور علم وآگہی نہیں ہے۔ اور وہ ان معانی میں لاعلم ہیں۔

ایک لاعلم معاشرے کے افراد چونکہ اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری نہیں کرتے اس لئے وہ مختلف طرح سے اس کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی پیروی کرتے ہیں جو ان ہی کی طرح اللہ کے نااہل بندے ہوتے ہیں یہ ان کو مثالی تصور کرتے اور ان کے خیالات ونظریات کو مطلق سچائیاں سمجھتے ہیں۔ بالآخر ایک لاعلم معاشرہ ایک ایسے معاشرے کے طور پر اختتام کو پہنچتا ہے جو اپنے آپ کو تیزی کے ساتھ اندھا کر لیتا ہے اور استدلال وآگہی سے مزید دور ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا اس نظام کا نہایت قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ مخالفین مذہب تلقین عقیدہ کرنے والے افراد کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ایک مؤثر تمثیل کے ذریعے ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی زندگی ایک کمزور اور گمراہ کن بنیاد کے سہارے کھڑی ہوتی ہے اور تباہی وبربادی اس کا مقدر ہوتی ہے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا طلبی پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات گگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا"۔ (سورۃ التوبہ:۱۰۹)

ابھی ایک اور بات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے: ہر معاشرے اور ہر فرد کو یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلقین عقیدہ، طرز زندگی اور لاعلمی کے فلسفے سے بچنا چاہے تو بچ جائے۔ اللہ لوگوں کی تنبیہ کے لئے اپنے پیغمبر مبعوث فرماتا ہے۔

اور انہیں اللہ کی موجودگی اور آخرت کے بارے میں، نیز مقصد حیات کے بارے میں بتانے کے لئے اپنے پیغمبروں کے ساتھ وہ رب کائنات آسمانی صحیفے نازل فرماتا ہے جن میں ان

تمام سوالات کے جوابات موجود ہوتے ہیں، جن سوالات کو لوگوں کے شعور و آگہی سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ اللہ ہی کا قانون ہے جو ازل سے موجود چلا آ رہا ہے۔ ہمارے اس عہد میں تمام لوگوں کے لئے رہنمائی وہدایت کی کتاب قرآن حکیم ہے۔

یہ کتاب لوگوں کو صراط مستقیم دکھاتی ہے اور ظلمت وتاریکی سے انہیں روشنی واجالے کی سمت لے جانے میں رہنمائی کرتی ہے۔ لوگوں کا محاسبہ ان کے اپنے اعمال کی بنیاد پر ہوگا۔ وہ پیغمبر خدا جو یہ کتاب لوگوں تک لائے ان سے یوں مخاطب ہوئے:

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۔

''اے محمد کہہ دو کہ ''لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لئے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لئے تباہ کن ہے اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں''۔ (سورۃ یونس: ۱۰۸)

عالم آخرت

وہ اصلی گھر جس کا وعدہ فرما دیا تھا

ہر اس شخص کے لئے جو دانا و بینا ہے یہ بات روز روشن کی مانند عیاں ہونی چاہئے کہ دنیا میں موجود اشیاء میں سے کوئی بھی، وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں سے کوئی ایک بھی واقعہ، اور کائنات میں جن قوانین کی پابندی کی جاتی ہے ان میں سے کوئی قانون بھی بیکار اور بے مقصد نہیں ہے۔ اس کائنات کی ساخت اور پائیداری کی بنیاد جیسا کہ ہم نے سابقہ ابواب میں دکھا دیا ہے، بے حد نپے تلے توازنات پر ہے۔ یہ توازنات اس حقیقت کو منکشف کرتے ہیں کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو کیا پھر کوئی یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ اسے بلا مقصد اور بیکار میں تخلیق کیا گیا تھا؟ یقیناً نہیں۔

اس کرۂ ارض پر بسنے والے کسی شخص کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے، جس کو کئی بلین کہکشاؤں میں ایک ذرہ برابر جگہ بھی حاصل نہیں ہے پھر یہ بات کس قدر خالی از استدلال ہو سکتی ہے جب کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس کائنات کو بلا مقصد تخلیق کیا گیا تھا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔

”پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا...... کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟“۔ (سورۃ المومنون: ۱۱۵)

اس کرۂ ارض پر زندگی کی موجودگی کو ان گنت حیرت انگیز مظاہر قدرت سے ممکن بنایا گیا ہے جن میں بگ بینگ سے لے کر ایٹموں تک، ایٹموں سے کہکشاؤں تک اور کہکشاؤں سے ہمارے سیارے یعنی اس زمین تک شامل ہیں۔ اس زمین پر زندگی کی منصوبہ بندی اس طرح کی ہے کہ اس کی ہر ضرورت کی پوری پوری منصوبہ بندی صناعی کی تمام تر نزاکت و لطافت کے ساتھ کی گئی ہے

اور اسے نہایت موزوں طریقے سے تخلیق کیا گیا ہے:

آسمان پر موجود سورج ضرورت کے مطابق توانائی فراہم کر رہا ہے، زیر زمین معدنی خزانے ہیں، زمین پر ہر طرف پودے، اشجار اور قسم قسم کے جانور نظر آتے ہیں۔ ان غیر معمولی واقعات کے باوجود لوگ پھر بھی خالق کے وجود کو مسترد کرتے ہیں۔ نطفے سے انسان کو بنایا مگر یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ وہ موت کے بعد پھر زندہ کئے جائیں گے جیسا کہ انہیں قرآن حکیم میں بتا دیا گیا ہے بلکہ بے تکی باتیں بناتے ہیں۔ اللہ نے قرآن حکیم میں کفار کے گمراہ کن استدلال کا ذکر فرمایا اور انہیں اس طرح جواب دیا گیا ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ٥ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ٥

"اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے: "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں"۔ اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"۔ (سورۃ یٰسین:۷۹-۷۸)

اللہ نے اس کائنات کی ہر شے کو ایک خاص مقصد کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ وہ انسان کی تخلیق کے بارے میں فرماتا ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ۔

"جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی"۔ (سورۃ الملک:۲)

یہ دنیا ایک آزمائش گاہ اور عارضی جگہ ہے۔ اس دنیا اور اس میں بسنے والوں کو ایک روز ختم ہو جانا ہے، اس کا وقت اللہ نے پہلے سے ہی مقرر کر دیا ہے۔ لوگوں کو جو مختصر سے عرصے کے لئے زندگی عطا کی گئی ہے اسے انہوں نے اللہ کے قوانین کے مطابق گزارنا ہے کیونکہ اس کی ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں فرما دیا گیا ہے۔ جو کچھ یہ لوگ اس دنیا کی زندگی میں یہاں کریں گے اس کا صلہ ان کو آخرت میں ملے گا۔

کبھی نہ ختم ہونے والی سزا

ہم نے اس کتاب کے صفحات میں اللہ کی موجودگی کی روشن نشانیوں کا ذکر کیا ہے، نظام کی وکالت کرنے والے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو اللہ کا انکار کرتے ہیں اور اس سماجی تناظر کے بارے میں بتایا ہے جسے وہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اب تک جس جس بات پر بحث کی گئی ہے اس کا تعلق ''اس دنیا کی زندگی'' سے تھا۔ تاہم موت کے بعد کیا ہے یعنی ''آخرت'' یا ''حیات بعد ممات'' جس پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کی بھی یکساں طور پر ضرورت ہے۔

وہ گروہ جو نظاموں کی بات کرنے پر زور دیتے ہیں اور جو اللہ کے انکار پر انحصار کرتے ہیں اپنے پیروکاروں کو اس دنیا میں المناک زندگی کی پیشکش کرتے ہیں۔ یہ وہ گروہ ہیں جو اپنے پیروکاروں کے لئے آخرت میں ایک بہت بڑی سزا بھگتنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس دنیا میں جو احمق اور عقل کے اندھے لوگ ان کی پیروی کیا کرتے تھے یہ گروہ وہاں اس توجہ کا مظاہرہ نہیں کر سکیں گے جو توجہ یہ ان احمقوں پر یہاں دیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس یہ وہاں تو اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں گے جیسا کہ اس سورۃ میں بیان فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

''اگر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لئے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا''۔ (سورۃ یونس: ۵۴)

ان لوگوں کا رویہ کیا ہوتا ہے جو اس دنیا میں کفر و الحاد کے علمبردار ہوتے ہیں، اس بارے میں بھی قرآن حکیم میں بتا دیا گیا ہے:

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ○ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○

''ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیشرو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا حتیٰ کہ جب

سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہوگا ہر ایک کے لئے دوہرا عذاب ہی ہے مگر تم جانتے نہیں ہو اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابل الزام تھے) تو تم ہی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی، اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو"۔ (سورۃ الاعراف: ۳۹-۳۸)

ہم نے دیکھا کہ اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا اگر کوئی اس گروہ کا رکن ہے جو سب سے زیادہ منکرین خدا ہیں یا اس کا جو اس معاملے میں کچھ پیچھے ہے۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دونوں گروہوں کو سخت عذاب ملتا ہے اور اس دنیا میں جو گناہ انہوں نے کئے ان کے لئے انہیں کبھی نہ ختم ہونے والی سزا ملنی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے تفصیل کے ساتھ ان لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمادیا ہے کہ یہ کن حالات میں ہوں گے اور ان کے اس وقت احساسات کیا ہوں گے، نیز انہیں قیامت کے روز جو یوم حساب ہوگا کیا سزا سنائی جائے گی اور کس طرح ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

روزِ قیامت

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں روزِ قیامت کا ذکر یوں بیان فرماتا ہے:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ ۔

"جس روز پکارنے والا ایک سخت ناگوار چیز کی طرف پکارے گا"۔ (سورۃ القمر: ۶)

اس روز کی دہشت سے انسان واقف نہیں ہیں اس لئے کہ ان کا اس طرح کی دہشت سے کبھی اس دنیا میں واسطہ نہیں پڑا۔

اس روز قیامت کی آمد کے وقت کے بارے میں صرف اللہ علم رکھتا ہے۔ اس روز کے بارے میں لوگوں کا علم اسی قدر ہے جس قدر قرآن پاک میں بتایا گیا ہے۔ یوم حشر اچانک آئے گا جب کوئی اس کی توقع بھی نہ رکھتا ہوگا۔

یہ روز لوگوں کو اچانک آن لے گا جب وہ اپنے دفاتر میں کام کر رہے ہوں، گھروں میں نیند کے مزے لوٹ رہے ہوں گے، فون پر کسی سے ہم کلام ہوں گے، کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں گے، قہقہے لگا رہے ہوں گے، چیخ رہے ہوں گے یا بچوں کو سکول چھوڑنے جا رہے ہوں گے۔ مزید یہ کہ یہ پکڑ اس قدر خوفزدہ کر دینے والی ہوگی کہ کسی نے بھی زندگی میں اس سے قبل ایسی پکڑ نہ دیکھی ہو

گی۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِo فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌo

''قیامت کا دن اس گھڑی ہو گا جب صور میں پھونک ماری جائے گی''۔ (سورۃ المدثر:۹-۸)

جب یہ آواز دنیا بھر میں سنی جائے گی تو وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے وقت کو اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے استعمال نہیں کیا، انہیں ایک خوف آ گھیرے گا۔ اس روز جو دہشت زدہ کر دینے والے واقعات پیش آئیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر قرآن پاک میں فرما دیا ہے:

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّo

''بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیام ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے''۔ (سورۃ القمر:۴۶)

قرآن پاک کی سورۃ الزلزال میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ صور پھونکا جائے گا تو اس کے بعد ایک چنگھاڑ سنائی دے گی جس سے زمین کانپ اٹھے گی۔ یہ آواز کان پھاڑ دینے والی ہو گی۔ اس سے پہاڑ لرزنے لگیں گے اور اپنی جگہ سے کھسکنا شروع ہو جائیں گے۔

سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہوا:

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّاo فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّاo

''اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے'' (الواقعہ:۶-۵) اس لمحے لوگ یہ بات بخوبی سمجھنے لگیں گے کہ وہ جن چیزوں سے اب تک محبت کرتے رہے ہیں وہ کس قدر غیر اہم اور گھٹیا تھیں۔ وہ جن مادی اقدار سے عمر بھر چمٹے رہے وہ اچانک غائب ہو جائیں گی:

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰىo يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰىo وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰىo

''پھر جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی''۔ (سورۃ النازعات:۳۶-۳۴)

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِo

''وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے'' (سورۃ القارعہ:۵)

انسان اب اس بات سے باخبر ہو جاتا ہے کہ یہ طاقت فطرت کی طاقت نہیں ہے اس لئے کہ اس روز فطرت بھی کمزور وناتواں بنادی جائے گی۔ اس روز ہر شے پر انتہائی خوف چھایا ہوا ہو گا۔ یہ خوف اور دہشت انسانوں، جانوروں اور مظاہر فطرت سبھی پر طاری ہوگی۔ لوگ دیکھیں گے کہ ''سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے'' (سورۃ الانفطار:۳) ''اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے'' (سورۃ التکویر:۶)

آسمان زمین کی مانند تھر تھر کانپنے لگیں گے اور پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، ایسا دل ہلا دینے والا منظر انسانی آنکھ نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ نیلگوں آسمان اپنا رنگ بدل لے گا اور اب وہ '' پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا'' (سورۃ المعارج:۸)۔ ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا'' (سورۃ التکویر:۱) اور ہر شے جو آسمان پر روشنی دیا کرتی تھی اچانک تاریک ہو جائے گی۔ ''قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا'' (سورۃ القمر:۱)۔ ''اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے''۔ (سورۃ القیمۃ:۹)

اس روز کے خوف کی وجہ سے حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ اس ڈر سے بچوں کے سر سفید ہو جائیں گے اور وہ اپنی ماؤں سے دور بھاگیں گے، بیویاں اپنے شوہروں سے بھاگیں گی اور خاندان ایک دوسرے سے۔ اس کا سبب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے:

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ o يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيهِo وَاُمِّهٖ وَاَبِيهِo وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيهِo لِكُلِّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَانٌ يُّغْنِيهِo

''آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی۔ اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا''۔ (سورۃ عبس:۳۷-۳۳)

یوم حساب

قیامت کے روز پیش آنے والے وہ تمام واقعات جن کا ذکر اوپر کیا گیا، جب پیش آ چکے ہوں گے تو ''صور اسرافیل'' دوسری بار پھونکا جائے گا۔ یہ آواز اس یوم کے آغاز پر سنائی دے گی

جس روز ہر مردہ زندہ کر دیا جائے گا۔ اس روز حشر کے میدان میں ان لوگوں کا جم غفیر ہوگا جنہیں قبروں سے زندہ اٹھایا گیا ہوگا، انہیں ان قبروں میں سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر چکے ہوں گے۔ انہیں اس روز دوبارہ زندہ کرنے اور جس پریشانی میں یہ لوگ ہوں گے اس کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح آیا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ٥ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ﱑ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ٥ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ٥ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ٥

''پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکا یک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لئے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ گھبرا کر کہیں گے: ''ارے یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا؟'' یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ فرمایا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی''۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔ آج کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے ہو''۔ (سورۃ یٰس: ۵۱-۵۴)

اس روز ہر وہ چیز جس کے بارے میں لوگوں نے سوچنے سے انکار کر دیا تھا، جسے سمجھنے کے لئے وہ تیار نہ تھے اور جس سے وہ دور بھاگا کرتے تھے بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آجائے گی۔ ان کے لئے نہ تو فرار کا کوئی راستہ کھلا رہ جائے گا نہ انکار کی کوئی صورت نظر آئے گی۔

جس وقت یہ لوگ اپنے چہروں پر ذلت و رسوائی اور ندامت لئے اپنی قبروں سے سر جھکائے نکلیں گے اور اکٹھے ہوں گے تو زمین روشن ہو جائے گی اور ان کا نامۂ اعمال ایک ایک کر کے سب کے ہاتھوں میں تھما دیا جائے گا۔

لوگوں کا اتنا بڑا مجمع ایک جگہ اکٹھا ہوگا جتنا بڑا اس سے پہلے کبھی بھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اس موقع پر ایمان والوں اور اللہ کا انکار کرنے والوں کے درمیان یقیناً بڑا فرق ہوگا۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے:

فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ٥ إِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ٥ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ٥

''اس وقت جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: ''لو دیکھو پڑھو میرا نامۂ اعمال، میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے'' پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا''۔ (سورۃ الحاقہ: ۲۱-۱۹)

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْo وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْo يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَo مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْo هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْo

''اور جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: ''کاش میرا نامۂ اعمال مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہوگیا''۔ (سورۃ الحاقہ: ۲۹-۲۵)

اس روز کسی کے ساتھ ایک ذرّے کے وزن کے برابر بھی ناانصافی نہ کی جائے گی۔ جو کچھ کسی نے اس دنیا میں کیا اس کا پورا پورا صلہ اسے مل جائے گا۔ منکرین خدا کے لئے یہ دن انتہائی مشکل و پریشانی کا ہوگا۔ اس روز انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کردیا جائے گا۔

درج ذیل آیات میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ یوم حساب ایسے لوگوں کا حشر کیا ہوتا ہے جو عمر بھر اللہ کا انکار کرتے رہے اور جنہوں نے عاقبت نااندیش افراد کی پیروی کی:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَo وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِآْيْءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَo وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَo وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ط حَتّٰىٓ اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ط قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَo قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ج فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَo

''پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکا یک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔ زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ کتاب اعمال لاکر رکھ دی جائے گی۔ انبیاء اور تمام گواہ حاضر کردیئے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کردیا جائے گا، ان پر

کوئی ظلم نہ ہوگا اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ (اس فیصلے کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا؟" وہ جواب دیں گے: "ہاں آئے تھے مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا"۔ کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لئے"۔ (سورۃ الزمر: ۷۲-۶۸)

جہنم

وہ گناہ عظیم جس کا کوئی انسان مرتکب ہو سکتا ہے وہ اللہ کے خلاف بغاوت ہے، جو خالق ہے اور زندگی عطا کرنے والا ہے۔ انسان کو اللہ نے اپنی بندگی و اطاعت کے لئے پیدا کیا ہے اور اگر وہ اپنی تخلیق کے مقصد سے متصادم ہو جائے تو لامحالہ وہ اپنے غلط کاموں کے لئے قرار واقعی سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جہنم وہ ٹھکانہ ہے جہاں یہ سزا کاٹنی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ پوری عمر ایک طرح کے نشے میں گزارتے ہیں اور اس جانب انہیں کبھی خیال نہیں آتا۔ اس نشے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کو صحیح سمجھ نہیں پاتے۔ بہت سے لوگ اللہ کو اس کی رحیمی و غفاری کی وجہ سے تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اس سے اس طرح نہیں ڈرتے جس طرح ڈرنا چاہئے۔ اس کی وجہ سے یہ لوگ اللہ کے احکامات اور ہدایات کے بارے میں بے حس ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں کو بطور خاص اس خطرے سے قرآن پاک میں پہلے سے متنبہ کر دیا ہے:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝

"لوگو بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف

سے بدلہ نہ دے گا، اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ لینے والا ہوگا فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے"۔ (سورۃ لقمان:۳۳)

بیشک اللہ خوبصورت ناموں اور جمیلہ صفات کا مالک ہے۔ وہ مشفق، رحیم اور غفار ہے۔ تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ اس کے ساتھ ساتھ دائمی منصف، سب پر غالب اور قہار بھی ہے؛ اور یہ کہ اللہ ایمان والوں کے قریب اور بت پرستوں، کافروں اور منافقین سے بہت دور ہوتا ہے؛ وہ جزا وسزا کا مالک ہے؛ اور جہنم وہ مقام ہے جہاں اس کی مؤخر الذکر صفات کی نہایت کامل صورت گری ہوگی۔

اس موضوع پر کچھ لوگ کسی وجہ سے توہم پرستانہ اعتقادات رکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ موت کے بعد وہ دنیا میں کئے جانے والے اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں چلے جائیں گے اور سزا بھگتنے کے بعد پھر جنت میں چلے جائیں گے جو ہمیشہ کے لئے ان کا مسکن ہوگا۔ تاہم اللہ قرآن پاک میں ہمیں باخبر فرماتا ہے کہ جہنم اور جنت دونوں میں زندگی ہمیشہ کی زندگی ہوگی اور جب تک اللہ نے نہ چاہا کوئی وہاں سے نکل نہ سکے گا:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَo بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَo وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَo

"وہ کہتے ہیں دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کرسکتا؟ یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمہیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوئے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطا کاری کے چکر میں پڑے گا وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

(سورۃ البقرۃ:۸۲-۸۰)

دوزخ میں لوگوں کو جن اذیتوں کا سامنا ہوگا ان میں آگ، گرمی، تاریکی، دھواں، تنگی و

گھٹن، اندھا پن، کھچاوٹ، بھوک، پیاس، پانی کی جگہ پیپ، کھولتا پانی، زقوم کا زہریلا درخت شامل ہوگا۔ مہلک جسمانی سزاؤں کے علاوہ انہیں ''اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی'' سے بھی جلنا ہوگا (سورۃ ہمزہ :۹-۵) ۔ قرآنی آیات میں دوزخ کے عذاب کا ذکر بالتفصیل کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ موضوع انسان کے لئے کس قدر اہم ہے۔ دوزخ کا عذاب اس قدر بڑا ہے کہ اس کا موازنہ کسی دنیاوی تکلیف سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اللہ نے قرآن پاک میں اس خوفناک آخری عذاب کا ذکر فرمایا جو کافروں کا منتظر ہے:

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

''ہرگز نہیں وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے) (سورۃ ہمزہ:۹-۴)

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِىْ مِنْ جُوْعٍ ۝

''کچھ چہرے اس روز خوفزدہ ہوں گے، سخت مشق کر رہے ہوں گے تھکے جاتے ہوں گے، شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے، کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا، خاردار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لئے نہ ہوگا جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے''۔ (سورۃ الغاشیہ :۷-۲)

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِىْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝

''یہ دوزخ ہے جسے گناہگار جھٹلاتے رہے: اس میں اور اس کے کھولتے ہوئے پانی میں انہیں رہنا ہوگا''۔ (سورۃ رحمٰن:۴۴-۴۳)

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝

''کفر کرنے والوں کے لئے ہم نے زنجیریں، اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے''۔ (سورۃ الدھر:۴)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ج لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ط كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ o وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ج رَبَّنَا اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ط اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ط فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ o

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لئے جہنم کی آگ ہے۔ نہ ان کا قصہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ ان کے لئے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو۔ وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ ''اے ہمارے رب ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے'' (انہیں جواب دیا جائے گا) ''کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آ چکا تھا۔ اب مزا چکھو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے''۔ (سورۃ فاطر: ۳۷-۳۶)

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا o

''جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط''۔ (سورۃ الفرقان: ۳۴)

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا o وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا o لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا o

''وہ جب دور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے۔ اور جب یہ دست و پا بستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے (اس وقت ان سے کہا جائے گا) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو''۔ (سورۃ الفرقان: ۱۴-۱۲)

بہشت: بہو اصلی گھر جس کا مومنین سے وعدہ فرمایا گیا تھا

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ج جَزَآءً بِمَا كَانُوْا

يَعْمَلُوْنَ٥

''اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے تھے'' (سورۃ السجدہ:۱۷)

بہشت وہ مقام ہے جس کا ان مومنین سے وعدہ فرمایا گیا تھا، جو اللہ پر ایمان لے آئے تھے اور جنہوں نے اس کی اطاعت و بندگی قبول کر لی تھی۔ بہشت کا ذکر قرآن پاک کی بہت سی سورتوں میں کیا گیا ہے، یہاں قسم قسم کی خداوندی نعمتیں حاصل ہوں گی اور یہ دائمی فرحت و خوشی کا مسکن ہو گی۔ مومنین نے دنیا میں جو نیک کام کئے ان کے صلے میں اللہ ان کو بہشت عطا فرمائے گا۔

جنت وہ مقام ہے جہاں ''رحیم'' (جس کا رحم و کرم خالصتاً مومنین کے لئے ہے جو نہایت رحم والا ہے، جو ان کو انعامات سے نوازتا ہے جو اس کی نعمتوں کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرتے ہیں) کی صفت رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے جنت فرحت و خوشی کا وہ گھر ہے جہاں ہر وہ شے میسر ہو گی جس کی خواہش ایک مومن کی رُوح کو ہو گی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جیسا کہ کئی سورتوں میں بیان فرما دیا گیا ہے۔

کچھ لوگوں کے ذہنوں میں ''جنت'' کا بہت محدود سا تصوّر ہوتا ہے وہ اسے محض قدرتی خوبصورتی کا مقام سمجھتے ہیں جہاں فرحت بخش باغات اور مرغزار ہوں گے۔ مگر اس انسانی ذہن میں آنے والے جنت کے محدود سے تصوّر اور اس جنت میں بڑا فرق ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔

قرآن میں جس جنت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ہر وہ شے میسر ہو گی جس کی خواہش کوئی مومن کرے گا:

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّأَكْوَابٍ ۚ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنْتُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ٥

''اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہو گی۔ ان سے کہا جائے گا تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے''۔ (سورۃ الزخرف:۷۱)

ایک اور سورۃ میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنت میں اس سے بھی زیادہ کچھ ہو گا جتنے کی کوئی انسان خواہش کر سکے گا:

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ٥

''وہاں ان کے لئے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی

بہت کچھ ان کے لئے ہے"۔ (سورۃ ق:۳۵)

عام عقیدے کے برعکس دوسرے لفظوں میں، جنت میں بے شمار نعمتیں ہیں جو وہاں مل سکیں گی۔ ایسی نعمتیں جو ایک انسان نے دنیا میں زندگی بھر کبھی نہ دیکھی تھیں بلکہ جن کا وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس دنیا کی زندگی میں اللہ کی اطاعت اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے صلے میں مومنین کو جنت میں دائمی زندگی عطا ہوگی۔

وہ جنت جس کا مومنین سے وعدہ فرمایا گیا، قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں اس کا بیان اس طرح آیا ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اور اے پیغمبر جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور اس کے مطابق اپنے عمل درست کر لیں انہیں خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیئے جاتے تھے۔ ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے"۔ (سورۃ البقرۃ:۲۵)

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِىْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝

"بخلاف اس کے متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔ ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے۔ وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔ انہیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے"۔ (سورۃ الحجر:۴۸-۴۵)

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا

عَلَى الْاَرَآئِكِ ط نِعْمَ الثَّوَابُ ط وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًاo

''ان کے لئے سدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کئے جائیں گے، باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے اور اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام''۔ (سورۃ الکہف:۳۱)

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَo هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَo لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَo سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍo

''آج جنتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں۔ مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لئے وہاں موجود ہیں۔ جو کچھ وہ طلب کریں ان کے لئے حاضر ہے۔ رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے''۔ (سورۃ یٰسین :۵۸-۵۵)

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِيْنٍo فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍo يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَo كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍo يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَo لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِo فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُo

''خدا ترس لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے۔ وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آ چکی سو آ چکی، اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم کے عذاب سے بچاوے گا یہی بڑی کامیابی ہے''۔ (سورۃ الدخان:۵۷-۵۱)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَo

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی عمدہ اجر

ہے عمل کرنے والوں کے لئے"۔ (سورۃ العنکبوت: ۵۸)

ان انسانوں کیلئے تنبیہ جنہیں دائمی عذاب سے بچالیا جائے گا

یقیناً ہر انسان اس دنیا میں اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے آزاد ہے اور اسے جو راستہ وہ چاہے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ کوئی بھی اس بارے میں دوسرے پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرسکتا، نہ کوئی پابندی جبراً عائد کرسکتا ہے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کی مانند جو اللہ کے وجود اور اس کے دائمی عدل وانصاف پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان لوگوں کو متنبہ کریں جو اللہ کا انکار کریں اور جو اپنی موجودہ حالت اور راستے سے بے خبر ہوں۔ اللہ نے اپنے کلام میں ان لوگوں کی حالت زار کے بارے میں ہمیں اس طرح آگاہ فرمایا ہے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا طلبی پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جاگری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا"۔ (سورۃ التوبہ: ۱۰۹)

ایسے لوگ جو جان بوجھ کر اللہ کے کلام سے منہ موڑ لیتے ہیں یا جو نادانستہ طور پر اپنے خالق کو مسترد کردیتے ہیں آخرت میں ان کی نجات کا کوئی ذریعہ نہ بنے گا۔ اگر وہ توبہ نہیں کرتے اور اللہ کی جانب رجوع نہیں کرتے، جس نے انہیں تخلیق کیا تو پھر وہ سب سے بڑی ممکنہ سزائیں پائیں گے۔ وہ دائمی سزا جو ان کی منتظر ہے اس کا ذکر قرآن پاک میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

"اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں۔ اُن پہ آگ چھائی ہوئی ہوگی"۔ (سورۃ البلد: ۲۰-۱۹)

اس دائمی سزا سے بچنے اور دائمی طور پر جنت کا مستحق ہونے کا راستہ بالکل عیاں ہے:

کہ اس سے پہلے کہ بہت تاخیر ہو جائے اللہ پر صمیم دل سے ایمان لایا جائے، اپنی زندگی اس خالق و مالک کی خوشی تلاش کرنے میں گزار دی جائے۔

انتباہ

جس باب کا اب آپ مطالعہ کرنے چلے ہیں، یہ آپ کی زندگی کے ایک بے حد نازک راز پر سے پردہ اٹھانے والا ہے۔

اسے بغور اور پورے انہماک سے پڑھئے کیونکہ یہ ایک ایسے موضوع سے متعلق ہے جو خارجی دنیا میں، آپ کے زاویہ نگاہ میں بنیادی تبدیلی لا سکتا ہے۔ اس باب کا موضوع محض ایک زاویہ نگاہ ہی نہیں ہے، نہ یہ ایک مختلف انداز نظر ہے نہ روایتی فلسفیانہ فکر: یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان کو، اس پر یقین کرتے ہوئے یا نہ کرتے ہوئے، تسلیم کر لینا چاہئے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے آج سائنس بھی ثابت کر چکی ہے۔

مادے کے بارے میں ایک بالکل مختلف نقطۂ نظر

وہ لوگ جو اپنے گردونواح پر غور وفکر کرتے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کی جاندار اور بے جان چیزیں ضرور تخلیق کی گئی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا ''خالق کون ہے؟''

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر شے میں تخلیق کا جو عمل دکھائی دیتا ہے وہ اس کائنات کے خود بخود وجود میں آ جانے پر ممکن نہ تھا۔ مثال کے طور پر ایک کھٹمل کا خود بخود تخلیق ہو جانا ممکن نہ تھا۔ نظام شمسی نہ خود تخلیق ہو سکتا تھا نہ اس نظم وترتیب کے ساتھ قائم رہ سکتا تھا۔ نہ تو پودے، انسان، جرثومے، خون کے سرخ خلیے نہ ہی تتلیاں اپنے آپ پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس بات کا امکان ہی نہیں کہ یہ سب ''اتفاقاً'' وجود میں آ گئے ہوں گے، بلکہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ ہم درج ذیل فیصلے پر پہنچتے ہیں:

ہر شے جو ہمیں نظر آتی ہے اسے تخلیق کیا گیا ہے مگر جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ''خالق'' نہیں ہو سکتیں۔ جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ان کا خالق ان سے مختلف بھی ہے اور ان سب سے بالا وعظیم تر بھی۔ وہ ایک ایسی نہ نظر آنے والی ہستی ہے جس کی موجودگی اور صفات ہر شے سے جھلکتی ہیں۔

یہ وہ بات ہے جس پر وہ لوگ اعتراض کرتے ہیں جو اللہ کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی شرط یہ ہوتی ہے کہ جب تک وہ اس ذات بے ہمتا کو اپنی نظروں سے دیکھ نہ لیں گے اس وقت تک اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ لوگ جو ''تخلیق'' کی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کائنات میں پھیلی ہوئی ''تخلیق کی حقیقت'' کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور غلط ثبوت پیش کرتے

ہیں کہ یہ کائنات اور اس کی اشیاء تخلیق نہیں کی گئی ہیں اس سلسلے میں نظریۂ ارتقاء ان کی بے سود کوششوں کی ایک بڑی مثال ہے۔

وہ لوگ جو اللہ کا انکار کرتے ہیں ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں جو فی الحقیقت اللہ کے وجود سے منکر نہیں ہوتے بلکہ اس ذات باری تعالیٰ کا غلط ادراک کرتے ہیں۔ یہ تخلیق سے انکار نہیں کرتے بلکہ اللہ ''کہاں'' ہے کے بارے میں توہم پرستانہ عقائد رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اللہ ''عرش'' پر ہے۔ وہ چپ چاپ یہ تصور لئے پھرتے ہیں کہ اللہ ایک بہت بڑے سیارے کے پیچھے موجود ہے اور کبھی کبھار ''دنیاوی معاملات'' میں مداخلت کر لیتا ہے۔ یا یہ کہ وہ کبھی بھی مداخلت نہیں کرتا۔ اور اس نے اس کائنات کو تخلیق کیا پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور لوگوں کو اپنے مقدر کا فیصلہ خود کرنے کے لئے ان کے رحم وکرم پر رہنے دیا۔

کچھ دوسرے ایسے ہیں جنہوں نے یہ سن رکھا ہے کہ قرآن میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ اللہ ''ہر جگہ'' موجود ہے مگر وہ اس بات کا ادراک نہیں کر سکتے کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے۔ ان کے خیال میں اللہ ہر شے پر اسی طرح محیط ہے جس طرح ریڈیائی لہریں یا نہ نظر آنے والی، غیر مادی گیس ہو۔

تاہم یہ تصور اور دوسرے اعتقادات جو اس بات کو واضح نہیں کر پاتے کہ اللہ ''کہاں'' ہے (اور ہو سکتا ہے یہ اس کا انکار اسی وجہ سے کرتے ہوں) تمام کی بنیاد ایک مشترکہ غلطی ہے۔ بغیر کسی بنیاد کے وہ تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اللہ کے بارے میں غلط آراء قائم کر لیتے ہیں۔ یہ تعصب کیا ہوتا ہے؟

یہ تعصب مادے کی نوعیت اور اس کے خواص کے بارے میں ہوتا ہے۔ ہم مادے کے وجود کے بارے میں ایسے ایسے مفروضے قائم کر لیتے ہیں کہ ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ یہ موجود ہے یا نہیں یا یہ محض ایک سایہ ہے۔ جدید سائنس اس تعصب کو ختم کر دیتی ہے اور ایک نہایت اہم مرعوب کن حقیقت منکشف کرتی ہے۔ درج ذیل صفحات میں ہم اس حقیقت کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے جس کی طرف قرآن پاک نے بھی اشارہ کیا ہے۔

برقی اشاروں کی دنیا

جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے بارے میں تمام معلومات ہم تک ہمارے حواس خمسہ کے ذریعے پہنچتی ہے۔ ہم جس دنیا کو جانتے ہیں وہ مشتمل ہے اس پر جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے، ہاتھوں سے چھوتے، ناک سے سونگھتے، زبان سے چکھتے اور اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ ہم یہ کبھی نہیں سوچتے کہ وہ ''خارجی'' دنیا اس سے مختلف بھی ہوسکتی ہے جسے ہمارے حواس ہم تک پہنچاتے ہیں کیونکہ ہم تو اپنے روز پیدائش سے لے کر اب تک صرف ان ہی حواس پر انحصار کرتے چلے آ رہے ہیں۔

تاہم مختلف شعبوں میں جدید سائنسی تحقیق ایک بالکل مختلف سوجھ بوجھ کی جانب اشارہ کرتی ہے اور ہمارے حواس سے متعلق اور ان کے ذریعے ہم جس دنیا کا ادراک کرتے ہیں اس کے بارے میں شک وشبے کو جنم دیتی ہے۔

اس نقطہ نظر کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک ''خارجی دنیا'' کا تصور جو ہمارے ذہن میں بنتا ہے وہ تو برقی اشاروں سے ہمارے ذہنوں میں تخلیق ہونے والی شکل کا جواب ہوتا ہے۔

کسی شے سے آنے والی نقول یا بہروپ برقی اشاروں میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور دماغ میں ایک اثر پیدا کرتے ہیں۔ جب ہم ان کو ''دیکھتے'' ہیں تو دراصل ہم ان برقی اشاروں کے اثرات اپنے دماغوں میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

کسی شے سے آنے والی نقول یا بہروپ برقی اشاروں میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور دماغ میں ایک اثر پیدا کرتے ہیں۔ جب ہم ان کو ''دیکھتے'' ہیں تو دراصل ہم ان برقی اشاروں کے اثرات اپنے دماغوں میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

سیب کی سرخی، لکڑی کی سختی مزید یہ کہ آپ کی ماں، باپ، آپ کا خاندان اور ہر وہ شے جو آپ کی ملکیت ہے، آپ کا گھر، نوکری، اور اس کتاب کی سطور سب کچھ ان برقی اشاروں سے بنتا ہے۔

فریڈرک ویسٹر اس بات کی وضاحت کرتا ہے جس پر سائنس اس موضوع کے حوالے سے پہنچی ہے:

کچھ سائنسدانوں کے بیانات کہ "انسان ایک عکس ہے ایک تصویر ہے، ہر وہ شے جو اس کے تجربے میں آتی ہے، عارضی اور پرفریب ہے اور یہ کائنات ایک ظل ہے ایک سایہ ہے" آج سائنس نے لگتا ہے اسے ثابت کر دیا ہے۔

مشہور فلسفی جارج برکلے اس موضوع پر اس طرح تبصرہ کرتا ہے:

ہم مختلف اشیاء کی موجودگی پر یقین اس لئے رکھتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھتے اور چھوتے ہیں اور وہ ہمارے ادراک کے ذریعے منعکس ہوتی ہیں۔ تاہم ہمارا ادراک صرف ہمارے دماغ میں موجود خیالات پر مبنی ہوتا ہے۔ گویا یہ اشیاء جنہیں ہم اپنے ادراک کے ذریعے ذہن میں جگہ دیتے ہیں سوائے ہمارے خیالات کے کچھ نہیں ہوتیں اور یہ خیالات لازماً سوائے ہمارے دماغ کے کہیں اور نہیں ہوتے۔ چونکہ یہ سب صرف ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس وقت فریب میں آ جاتے ہیں جب ہم اپنے دماغ سے باہر کی دنیا اور اس میں موجود چیزوں کے بارے میں تصور کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گردونواح کی چیزوں کا ہمارے دماغ سے باہر کوئی وجود نہیں ہوتا۔

اس موضوع کو مزید واضح کرنے کے لئے آیئے ہم اپنی بصری حس پر غور کرتے ہیں جو ہمیں خارجی دنیا کے بارے میں ایک نہایت وسیع معلومات مہیا کرتی ہے۔

ہم دیکھتے، سنتے اور چکھتے کیسے ہیں؟

دیکھنے کا عمل ایک بہت تدریجی طریقے سے حاصل ہوتا ہے۔ روشنی کے فوٹون (Photons) جو کسی شے سے نکل کر آنکھ تک پہنچتے ہیں آنکھ کے سامنے والے حصے میں موجود عدسے (Lens) میں سے پار ہوتے ہیں جہاں یہ ٹوٹ کر پیچھے کی طرف آنکھ کے عقب میں واقع پردۂ چشم پر گرتے ہیں۔ یہاں گرنے والی یہ روشنی برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے جنہیں عصبانیے (Neurons) ایک ایسے چھوٹے سے نقطے کی جانب منتقل کر دیتے ہیں جس کو مرکز نگاہ

کہتے ہیں اور جو دماغ کے پچھلے حصے میں ہوتا ہے۔ دماغ میں اس مرکز نگاہ میں اس برقی اشارہ کا ادراک ایک عمل کی مختلف شکلوں کے بعد ایک تصویر کی مانند کیا جاتا ہے۔ دراصل دیکھنے کا فعل دماغ کے پچھلے حصے میں موجود اس چھوٹے سے نقطے میں واقع ہوتا ہے جہاں گھپ اندھیرا ہوتا ہے اور جو روشنی سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا ہوتا ہے۔

آیئے اب ہم اس بظاہر معمولی اور غیر اہم عمل پر از سرِ نو غور کرتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ''دیکھتے'' ہیں تو دراصل ہم ان محرکات کے اثرات کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ہماری آنکھوں تک پہنچ رہے ہوتے ہیں اور جو برقی اشاروں میں تبدیل ہو جانے کے بعد ہمارے دماغ میں جذب ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''ہم دیکھتے ہیں'' تو ہم دراصل اپنے دماغ میں برقی اشاروں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

ہم اپنی زندگی میں جن تصویروں کو دیکھتے ہیں وہ سب کی سب ہمارے مرکز نگاہ میں متشکل ہو رہی ہوتی ہیں۔ جو کتاب اس وقت آپ پڑھ رہے ہیں اور افق پر دیکھے گئے لاتعداد مظاہر فطرت اس چھوٹی سی جگہ میں سما جاتے ہیں۔ ایک اور بات جسے ذہن میں رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی یہ بات دیکھی کہ دماغ کو روشنی سے جدا کر دیا جاتا ہے؛ اس کے اندر کا حصہ بالکل تاریک ہوتا ہے اور دماغ کا روشنی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہتا۔

ہم اس دلچسپ صورت حال کو ایک مثال کے ذریعہ بیان کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے ایک جلتی ہوئی موم بتی ہے ہم اس موم بتی کے سامنے، اس پار بیٹھ سکتے ہیں جہاں جلتی ہوئی موم بتی ہمارے سامنے رکھی ہوتی ہے اور ہم اسے کچھ فاصلے سے دیکھتے ہیں۔ تاہم اس دوران ہمارے دماغ کا اس موم بتی کی اصل روشنی کے ساتھ براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ ہم جس وقت موم بتی کی روشنی کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دماغ کا اندرونی حصہ بالکل تاریک ہوتا ہے۔ ہم اپنے تاریک دماغ کے اندر ایک رنگین اور روشن دنیا دیکھ سکتے ہیں۔

دیکھنے کے حیرت انگیز پہلو کی وضاحت آر ایل گریگوری اس طرح کرتا ہے۔ ایک ایسا عمل جسے ہم اس قدر قابل تسلیم سمجھتے ہیں:

''ہم دیکھنے کے عمل سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس بات کا احساس کرنے کے لئے کہ کافی مسائل حل طلب ہیں، تصوّر ایک زقند لیتا ہے۔ ہمیں آنکھ کے اندر چھوٹی چھوٹی الٹی پلٹی تصویریں دی جاتی ہیں اور ہم ارد گرد علیحدہ ٹھوس اشیاء دیکھتے ہیں۔ پردۂ چشم پر نظر آنے والی نقالی یا بہروپ
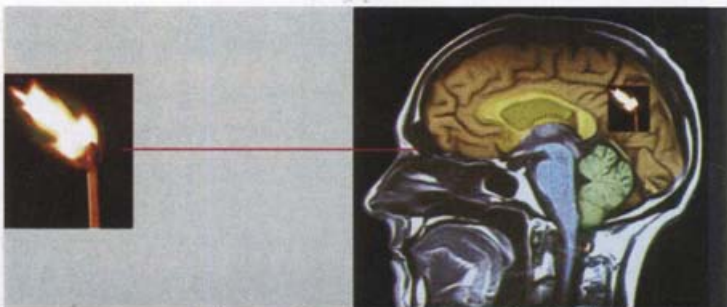
جس لمحے ہم آگ کی روشنی اور گرمی محسوس کرتے ہیں ہمارا دماغ اندر سے بالکل تاریک ہوتا ہے اور اس کا درجہ حرارت کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔

روشنی کی کرنیں جھنڈ کی شکل میں ایک شے سے نکل کر پردۂ چشم پر اوپر سے نیچے کی سمت پڑ رہی ہیں۔ یہاں تصویر برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نظر کے مرکز تک اس کی ترسیل ہو جاتی ہے، جو دماغ کے پچھلے حصے میں ہوتا ہے۔ دماغ چونکہ روشنی سے الگ کر دیا جاتا ہے اس لئے روشنی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ وہ نظر کے مرکز تک پہنچ سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم روشنی کی ایک وسیع دنیا اور گہرائی ایک چھوٹے سے نقطے میں دیکھتے ہیں، جسے روشنی سے الگ کر دیا گیا ہو۔

کے نمونوں میں ہم مختلف اشیاء کی دنیا دیکھتے ہیں اور یہ کسی معجزے سے کم بات تو نہیں ہوتی۔ اسی صورت حال کا اطلاق ہمارے دیگر حواس پر ہوتا ہے جو برقی اشاروں کی شکل میں دماغ کو منتقل کیے جاتے ہیں۔ سماعت، لمس، ذائقہ اور قوت شائمہ اور جن کا ادراک دماغ کے متعلقہ مراکز میں ہوتا ہے۔"

روشنی کی وہ کرنیں جمع ہو کر پردۂ چشم پر الٹی پلٹی گرتی ہیں، جو کسی شے سے خارج ہو رہی ہوں۔ یہاں تصویر برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور دماغ کے پچھلے حصے میں واقع پردۂ چشم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ دماغ چونکہ روشنی سے جدا کر دیا جاتا ہے اس لئے روشنی مرکز نگاہ

تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسے چھوٹے سے نقطے میں روشنی کی ایک وسیع اور گہری دنیا دیکھتے ہیں جسے روشن سے جدا کر دیا گیا ہو۔

حسِ سماعت بھی اسی طرح کام کرتی ہے۔ کان کا بیرونی حصہ لالہ گوش (Auricle) کے ذریعے آوازوں کو پکڑ کر انہیں کان کے وسطی حصے کی جانب بھیج دیتا ہے؛ کان کا درمیانی حصہ آواز کی لہروں کو تیز تر کر کے اندرونی حصے میں ارسال کر دیتا ہے؛ کان کا اندرونی حصہ ان صوتی لہروں کو برقی اشاروں میں تبدیل کر کے دماغ میں بھیج دیتا ہے۔ جیسا کہ آنکھ کے معاملے میں ہوتا ہے سماعت کا فعل دماغ میں مرکز سماعت میں حتمی شکل اختیار کرتا ہے۔ دماغ جس طرح روشنی سے جدا کر دیا جاتا ہے اسی طرح یہ آواز سے الگ کر دیا جاتا ہے اس لئے باہر جس قدر شور وغل بھی ہو دماغ کے اندر مکمل خاموشی ہوتی ہے۔

تاہم دماغ نہایت نازک ولطیف آوازوں کا ادراک بھی کر لیتا ہے۔ یہ اس قدر درستگی اور صحت کے ساتھ ہوتا ہے کہ ایک صحت مند انسان کا کان کسی بھی قسم کے ماحولیاتی شور اور مداخلت کے بغیر ہر بات صاف صاف سن سکتا ہے۔ آپ اپنے دماغ میں، جسے آواز سے جدا کر دیا گیا ہو، آرکیسٹرا پر نغمے سن سکتے ہیں کسی پر ہجوم جگہ کی شور وغل والی آوازیں سن سکتے ہیں اور پتے کی کھڑکھڑاہٹ سے لے کر جیٹ ہوائی جہاز کی کان کے پردے پھاڑ دینے والی آوازوں تک کا صحیح صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔ تاہم اگر اس وقت آپ کے دماغ کی صوتی سطح کی کسی حساس آلے سے

وہ تمام تصاویر جن کو ہم اپنی زندگیوں میں دیکھتے ہیں وہ ہمارے دماغ کے پچھلے حصے میں نظر کے مرکز میں منتقل ہوتی ہیں۔ یہ مرکز دماغ میں چند مربع سینٹی میٹر جگہ گھیرتا ہے۔ جو کتاب اس وقت آپ پڑھ رہے ہیں وہ اور وہ وسیع منظر جو آپ افق پر نگاہ ڈالتے وقت دیکھتے ہیں دونوں اس چھوٹی سی جگہ میں سما جاتے ہیں۔ اس لئے ہم چیزوں کو خارجی دنیا میں اس جسامت کے ساتھ نہیں دیکھتے جو ان کی اصل جسامت ہوتی ہے بلکہ ہم انہیں اس جسامت میں دیکھتے ہیں جس کا ادراک ہمارا دماغ کرتا ہے۔
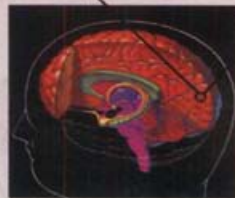
جس طرح ایک عام انسان بائیں طرف دی گئی تصویر میں گلاب کی رنگت کو دیکھتا ہے ایک رنگ کور (Colour-blind) اسی گلاب کے پھول کو خاکستری رنگ میں دیکھے گا دونوں میں سے "صحیح" رنگ کون سا ہے؟

پیمائش کی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہاں مکمل خاموشی ہے۔

ہماری حس شامہ، یعنی مہک اور بو باس سونگھنے کی حس بھی اسی طرح متشکل ہوتی ہے۔ طیران پذیر سالمے (Volatile molecules) جو ونیلا (VANILLA) یا گلاب کے پھولوں سے خارج ہوتے ہیں ناک کے ان نازک بالوں میں پہنچتے ہیں جو اس کے برحلمہ حصے (Epithelium region) میں ہوتے ہیں تو ایک باہمی تعامل (Interaction) میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس باہمی تعامل کو برقی اشاروں کی شکل میں دماغ میں ارسال کر دیا جاتا ہے جہاں اس کا ادراک بطور خوشبو یا مہک کے کیا جاتا ہے۔ ہم جو کچھ بھی سونگھتے ہیں، یہ خوشبو ہو کہ بدبو یہ ان طیران پذیر سالموں کا باہمی تعامل ہوتا ہے جنہیں برقی اشاروں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہو اور جس کا ادراک اب دماغ نے کیا ہو۔ آپ عطر کی خوشبو، پھول یا اپنی پسندیدہ خوراک کی خوشبو سونگھتے ہیں، یا سمندر کے پانیوں کی بو یا دوسری خوشبوئیں جن کو آپ کا دماغ پسند یا ناپسند کرتا ہے، کا ادراک آپ کا دماغ کرتا ہے۔ یہ سالمے خود بخود کبھی دماغ تک نہیں پہنچ سکتے۔ جس طرح وہ آواز یا تصویر جو آپ کے ذہن میں پہنچتی ہے وہ برقی اشارے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام خوشبوئیں جو آپ پیدائش سے اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ بیرونی اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں محض وہ برقی اشارے ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنے حسیاتی اعضاء کے ذریعے محسوس کرتے ہیں۔

اسی طرح چار قسم کے کیمیائی آخذ (Chemical Receptors) انسانی زبان کے سامنے والے حصے میں ہوتے ہیں۔ یہ نمکین، میٹھے، کھٹے اور تلخ ذائقوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ذائقہ چکھنے والے یہ آخذ بہت سی کیمیائی عمل پذیری کے بعد ہمارے ادراک کو برقی اشاروں میں تبدیل کر دیتے ہیں اور پھر انہیں دماغ کو ارسال کر دیتے ہیں۔ جب آپ پسندیدہ چاکلیٹ یا پھل کھاتے ہیں تو جو مزہ آپ کو آتا ہے وہ برقی اشاروں کی دماغ کے ذریعے تشریح ہوتی ہے۔ آپ باہر موجود کسی شے تک نہ کبھی پہنچ سکتے ہیں، نہ اسے دیکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں نہ ہی چاکلیٹ کو چکھ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ذائقہ معلوم کرنے والی رگیں جو دماغ تک جا رہی ہیں کٹ جائیں تو اس لمحے جو کچھ آپ کھائیں گے کسی کا ذائقہ بھی آپ کے دماغ تک نہ پہنچ سکے گا اور آپ چکھنے کی حس سے مکمل طور پر محروم ہو جائیں گے۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے: ہم یہ بات کبھی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک خوراک کھاتے وقت جو ذائقہ ہم محسوس کرتے ہیں ایک دوسرا شخص وہی خوراک کھاتے وقت ویسا ہی ذائقہ محسوس کرے گا۔ یا جب ہم کوئی آواز سنتے ہیں تو جو ادراک ہمیں ہوتا ہے وہی آواز سن کر ویسا ہی ادراک ایک دوسرے شخص کو بھی ہوگا۔ اس حقیقت پر لنکن بارنٹ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ ایک دوسرا انسان سرخ رنگ کا ادراک کر رہا ہے یا وہ بھی اس کی طرح ''سی'' سر سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

ہماری چھونے کی حس دوسروں کی اس حس سے مختلف نہیں ہوتی۔ جب ہم کسی شے کو چھوتے ہیں تو وہ تمام معلومات جو خارجی دنیا اور اشیاء کو پہچاننے میں ہماری مدد کر سکتی ہے ہماری جلد پر موجود حسی رگوں کے ذریعے دماغ کو ارسال کر دی جاتی ہے۔ چھونے کا احساس ہمارے دماغ میں متشکل ہو جاتا ہے۔ عام عقیدہ کے برعکس وہ جگہ جہاں ہم چھونے کے احساس کا ادراک کرتے ہیں وہ ہماری اپنی انگلیوں پر یا جلد پر فوری یادداشت میں نہیں آتے بلکہ ہمیں اس کا ادراک اپنے دماغ میں چھونے کے مرکز (مرکز لمس) پر ہو جاتا ہے۔ دماغ کے اس اندازے کے نتیجے میں جو وہ ان ہیجانوں کے بارے میں لگاتا ہے جو اشیاء سے آ رہے ہوتے ہیں ہم مختلف طرح کی حسی کیفیتیں ان اشیاء کے بارے میں محسوس کرتے ہیں مثلاً سختی یا نرمی یا ان کے گرم و سرد ہونے کے بارے میں۔ ہم کسی شے کو پہچاننے کے لئے وہ تمام تفصیلات ان ہیجانوں سے متعلق دو مشہور فلسفیوں رسل اور L. Wittgeinstein کے خیالات میں دیکھتے ہیں۔ ان کو ہم ذیل کی سطور میں پیش کر رہے ہیں:

مثال کے طور پر یہ کہ ایک لیمو واقعی وجود رکھتا ہے یا نہیں اور یہ کیسے وجود میں آیا، نہ تو اسے تشریح طلب بنایا جا سکتا ہے نہ اس کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ لیمو کی موجودگی کا پتہ زبان اسے صرف چکھ کر دے سکتی ہے، خوشبو کے بارے میں ناک سونگھ کر بتا سکتی ہے، رنگ وشکل کے بارے میں آنکھ دیکھ کر بتا سکتی ہے اور صرف اس کے ان خدوخال کو معائنے اور جائزے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ سائنس طبعی دنیا کو کبھی نہیں جان سکتی۔

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم طبعی دنیا تک پہنچ سکیں۔ ہمارے اردگرد کی تمام چیزیں مجموعہ ادراک ہیں مثلاً دیکھنا، سننا، اور چھونا۔ مرکز نگاہ اور دوسرے مراکز احساس کے اعداد وشمار کو ایک خاص عمل سے گزار کر دماغ کا ہماری ساری زندگی کے دوران خارجی دنیا کے مادے کی ''اصلیت'' سے کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا بلکہ اصل کی وہ نقل جو ہمارے دماغ کے اندر متشکل ہوتی ہے وہ اسی کو دیکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اس مفروضے سے بھٹک جاتے ہیں کہ یہ نقول ہماری خارجی دنیا کے اصل مادے کی مثالیں ہیں۔

''خارجی دنیا'' ہمارے دماغ کے اندر

اب تک جو طبعی حقائق بیان کئے جا چکے ہیں ان کے نتیجے میں ہم درج ذیل نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ ہر وہ شے جسے ہم دیکھتے، چھوتے، سنتے اور مادے کے طور پر جس کا ادراک کرتے ہیں، ''دنیا'' یا ''کائنات'' سوائے ان برقی اشاروں کے کچھ بھی نہیں ہیں جو ہمارے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔

جب کوئی انسان پھل کھا رہا ہو تو دراصل اس کا سامنا اصل پھل سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے ادراک سے ہوتا ہے جو دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ انسان جسے ''پھل'' تصور کرتا ہے وہ دراصل پھل کی شکل، ذائقے، خوشبو اور اس کی بناوٹ کے برقی نقش پر مشتمل ہوتا ہے جو اس کے دماغ میں بنتا ہے۔ اگر بصارت کی رگ جو دماغ تک جا رہی ہے اچانک کٹ جاتی ہے تو پھل کی تصویر فوراً غائب ہو جائے گی۔ یا ناک کے اندر سے دماغ تک جانے والی حسی رگ منقطع ہو جاتی ہے تو سونگھنے کی حس بری طرح متاثر ہوگی۔ اس بات کو مزید سادہ وآسان طریقے سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ پھل ماسوا دماغ کی طرف سے برقی اشاروں کی، کی جانے والی تشریح کے کچھ بھی نہیں ہے۔

مصنوعی ہیجانات کے نتیجے میں ایک طبعی دنیا جو اتنی ہی اصلی اور حقیقت پسندانہ ہوگی جتنی کہ اصلی، طبعی دنیا کی موجودگی کے بغیر ہمارے دماغ میں تشکیل پا سکتی ہے۔ ان مصنوعی ہیجانات کے نتیجے میں ایک شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ کار چلا رہا ہے جبکہ دراصل وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔

ایک اور قابل غور بات حس فاصلہ ہے۔ فاصلہ، مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے اور اس کتاب کے درمیان فاصلہ، آپ کے دماغ میں تشکیل پانے والا احساس خالی پن یا احساس خلاء ہے۔ اس انسان کے خیال میں جو چیزیں دور نظر آتی ہیں دماغ میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو آسمان پر جو ستارے نظر آتے ہیں وہ انہیں اپنے آپ سے کئی بلین نوری سال دور تصور کرتا ہے مگر جو ستارے اسے نظر آ رہے ہیں وہ درحقیقت اس کے اپنے اندر مرکز نگاہ میں موجود ہیں۔

جس وقت آپ یہ سطریں پڑھتے ہیں آپ دراصل کمرے میں نہیں ہیں جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں؛ اس کے برعکس کمرہ آپ کے اندر ہے۔ آپ کا اپنے جسم کو دیکھنا آپ کے ذہن میں یہ خیال لاتا ہے کہ آپ اس کے اندر ہیں۔ تاہم آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ آپ کا جسم بھی ایک ایسی شبیہ ہے جو آپ کے دماغ کے اندر بن چکی ہے۔

اسی کا اطلاق آپ کے باقی کے ہر ادراک پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو اگلے کمرے میں ٹی وی کی آواز آ رہی ہے تو آپ دراصل اپنے دماغ کے اندر اس آواز کے

تجربے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ آپ نہ تو یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک کمرہ آپ کے کمرے سے ملحقہ ہے۔ نہ یہ کہ یہ آواز اس ٹی وی سے آ رہی ہے جو اس کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ آواز جسے آپ سمجھتے ہیں کہ چند میٹر کے فاصلے سے آ رہی ہے اور کسی ایسے انسان کی باتوں کی آواز جو آپ کے بالکل قریب ہے دونوں کا ادراک آپ کے دماغ کے اندر چند مربع سینٹی میٹر کے مرکز میں ہو رہا ہوتا ہے۔ اس مرکز ادراک سے ہٹ کر کوئی بھی دائیں، بائیں، سامنے، پیچھے کا تصور موجود نہیں ہوتا۔ یعنی آواز آپ تک دائیں جانب سے نہیں آتی، نہ بائیں طرف سے نہ فضا سے؛ کوئی ایسی سمت نہیں ہوتی جہاں سے آواز آ رہی ہو۔

جو کچھ آپ سونگھتے ہیں وہ عمل بھی اسی طرح کا ہوتا ہے؛ ان میں سے کوئی بھی آپ تک طویل فاصلے سے نہیں پہنچتی۔ آپ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ آپ کے سونگھنے کے مرکز میں جو حتمی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ باہر موجود چیزوں کی خوشبو ہے۔ تاہم جس طرح ایک گلاب کی شبیہ آپ کے مرکز نگاہ میں ہوتی ہے اسی طرح اس گلاب کی خوشبو آپ کے سونگھنے کے مرکز میں ہوتی ہے؛ باہر نہ گلاب ہوتا ہے نہ اس کی خوشبو۔

ہمارے ادراک جس ''خارجی دنیا'' کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں ان برقی اشاروں کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہمارے دماغ میں پہنچ رہے ہوتے ہیں۔ عمر بھر ان اشاروں کو ہمارا دماغ ایک عمل سے گزارتا رہتا ہے اور ہم اس حقیقت کو پہچانے بغیر اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں کہ ہم سے ''خارجی دنیا'' میں موجود ان چیزوں کو اصلی جاننے میں غلطی سرزد ہوئی ہے۔ ہم اس لئے بھٹک گئے ہوتے ہیں کیونکہ ہم اپنے حواس کے ذریعے اصل مادے تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔

مزید یہ کہ ہم جن اشاروں کو ''خارجی دنیا'' سمجھ رہے ہوتے ہیں ایک بار پھر ہمارا دماغ ہی ان کی تشریح کر رہا ہوتا ہے اور انہیں کچھ معنی پہنا رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آیئے ہم حس سماعت (قوت سامعہ) کی بات کرتے ہیں۔ دراصل ہمارا دماغ صوتی لہروں کو ''خارجی دنیا'' میں ایک سر یا نغمہ و آہنگ میں تبدیل کرتا ہے۔ یعنی موسیقی بھی ایک ادراک ہے جسے ہمارا دماغ تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح جب ہم ان رنگوں کو دیکھتے ہیں جو ہماری نظروں تک پہنچتے ہیں تو یہ محض وہ برقی اشارے ہوتے ہیں جو مختلف طول موج (Wave length) کے ہوتے ہیں۔

یہاں پھر ہمارا دماغ ہی ان اشاروں کو رنگوں میں تبدیل کرتا ہے۔ ورنہ ''خارجی دنیا'' میں کوئی رنگ نہیں ہوتے۔ نہ سیب سرخ ہوتا ہے، نہ آسمان نیلگوں نہ اشجار سبز۔ وہ ایسے اس لئے نظر

آتے ہیں کہ ہم ان کا ادراک اس طرح کرتے ہیں۔ ''خارجی دنیا'' کا انحصار مکمل طور پر ادراک کرنے والے پر ہوتا ہے۔

پردۂ چشم میں معمولی سا نقص بھی رنگوندھیلا (Colour Blindness) پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کو نیلا رنگ سبز نظر آتا ہے کچھ کو سرخ، نیلا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں تمام رنگ خاکستری رنگ ہی کی مختلف شکلیں دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورتحال میں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا خواہ باہر کی شے رنگین ہے یا نہیں۔

مشہور مفکر برکلے نے بھی اس حقیقت پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

ابتداء میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ رنگ اور خوشبوئیں وغیرہ ''حقیقت میں'' ایک وجود رکھتی ہیں مگر پھر ان نظریات کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ ان سب کا انحصار ہمارے حواس (Sensations) پر ہے۔

ہمیں مختلف چیزیں رنگین کیوں نظر آتی ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ رنگدار ہیں یا ان کا ہمارے باہر ایک آزاد مادی وجود ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ تمام خواص جو ہم ان اشیاء سے منسوب کرتے ہیں ''خارجی دنیا'' میں نہیں بلکہ ہمارے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ تو پھر اس ''خارجی دنیا'' میں کیا باقی رہ جاتا ہے؟

کیا ''خارجی دنیا'' کا وجود ناگزیر ہے؟

اب تک ہم نے ''خارجی دنیا'' اور اپنے دماغ میں ادراک سے تشکیل پانے والی دنیا کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ان میں سے مؤخر الذکر وہ ہے جسے ہم دیکھتے ہیں۔ تاہم چونکہ ہم ''خارجی دنیا'' تک فی الحقیقت کبھی نہیں پہنچ سکتے تو پھر ہمیں یہ یقین کیسے آجائے کہ اس قسم کی دنیا کا واقعی کوئی وجود ہے؟

دراصل ہم یقین کر بھی نہیں سکتے۔ چونکہ ہر شے ہمارے ادراک کا مجموعہ ہوتی ہے اور وہ ادراک صرف ہمارے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اس لئے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ دنیا جو فی الحقیقت وجود رکھتی ہے وہ ہمارے ادراک کی دنیا ہے۔ صرف ایک ہی ایسی دنیا ہے جسے ہم جانتے ہیں اور وہ ہے وہ دنیا جو ہمارے ذہنوں میں موجود ہوتی ہے: وہ جو ایک شکل رکھتی ہے، ذہنوں میں ریکارڈ ہو جاتی ہے اور وہاں نمایاں بنا دی جاتی ہے۔ مختصراً وہ جو ہمارے ذہن میں تخلیق کی جاتی

ہے۔یہی وہ واحد دنیا ہے جس کا ہمیں یقین ہوسکتا ہے۔

ہم یہ بات کبھی ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے دماغ میں جس ادراک کا مشاہدہ کرتے ہیں کوئی مادی باہمی ربط رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ ادراک ایک ''مصنوعی'' منبع سے آرہے ہوں۔

اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ غلط اور نادرست ہیجانات ہمارے دماغ میں ایک بالکل تصوراتی ''مادی دنیا'' پیدا کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیئے ایک ایسے ترقی یافتہ ریکارڈ کرنے والے آلے کے بارے میں سوچتے ہیں، جس میں تمام قسموں کے برقی اشارے ریکارڈ کئے جا سکتے ہیں۔ آیئے ہم سب سے پہلے متعلقہ اعداد وشمار کو اس آلے میں ان کو برقی اشاروں میں تبدیل کر کے ایک خاص ترکیب کے لئے ارسال کرتے ہیں (جس میں جسم کی شبیہ بھی شامل ہو)۔ ثانیاً ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ آپ کا دماغ جسم کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور آخر میں ہم اس آلۂ ریکارڈنگ کو دماغ کے ساتھ ان برقی مورچیوں (Electrodes) کے ذریعے اور پہلے سے ریکارڈ شدہ اعداد و شمار (Data) کو دماغ میں بھیجیں گے۔ اس صورت حال میں آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ آپ اس مصنوعی طور پر تخلیق شدہ ترکیب میں رہ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ بڑی آسانی کے ساتھ اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ آپ کسی شاہراہ پر تیز گاڑی چلا رہے ہیں۔ یہ بالکل ممکن نہیں ہوتا کہ آپ یہ سمجھنے لگیں کہ آپ کا وجود صرف آپ کے دماغ پر مشتمل ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ آپ کے دماغ کے اندر جس شے کی ضرورت ہے کہ وہ ایک دنیا تشکیل دے سکے، وہ حقیقی دنیا کا وجود نہیں ہے بلکہ ہیجانات کا میسر آنا ہے۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ یہ ہیجانات ایک مصنوعی ماخذ مثلاً ایک (Recorder) صوت نگار مشین سے آرہے ہوں۔ اس سلسلے میں مشہور سائنسدان و فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

جہاں تک قوت لامسہ کا تعلق ہے جب ہم کسی میز کو اپنی انگلیوں سے تھپتھپاتے ہیں تو سر انگشت کے الیکٹرون اور پروٹون میں خلل پیدا کرتے ہیں، یہ خلل جدید طبیعات کے مطابق میز میں موجود الیکٹرون اور پروٹون کے قرب سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی اور طرح سے ہمارے سر انگشت میں یہ خلل پیدا ہو جائے تو میز کے بغیر بھی ہمارے اندر انگیخت پیدا ہوگی۔

ہم بیشک بڑی آسانی کے ساتھ یقینی ادراک کا دھوکہ کھا جائیں گے حالانکہ کوئی مادی باہمی ربط حقیقی صورت میں موجود نہ ہوگا۔

ہمیں اس قسم کا تجربہ اکثر اپنے خوابوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے خوابوں میں مختلف

واقعات پیش آتے ہیں، ہم لوگوں کو دیکھتے ہیں ہمیں چیزیں نظر آتی ہیں اور مختلف چیزوں کی ایسی ترکیب نظر آتی ہے جو بالکل اصل دکھائی دیتی ہوں تاہم یہ سوائے ہمارے ادراک کی پیداوار کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک خواب اور ''حقیقی دنیا'' میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا، دونوں کا تجربہ دماغ میں ہوتا ہے۔

مدرک (محسوس کرنے والا) کون ہے؟

جیسا کہ ہم اب تک یہ ذکر کرتے آئے ہیں کہ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دنیا جس کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں بس رہے ہیں اور وہ جسے ہم ''خارجی دنیا'' کہتے ہیں ہمارے دماغ کے اندر تخلیق ہوتی ہے۔ تاہم اس بارے میں یہاں ایک بنیادی نوعیت کا سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ تمام طبعی واقعات جنہیں ہم جانتے ہیں درونِ دماغ پیدا ہونے والے ادراک ہیں تو پھر یہ ہمارا دماغ کیا ہے؟ ہمارا دماغ چونکہ طبعی دنیا کا ایک حصہ ہے جیسے ہمارا بازو، ٹانگ یا کوئی دوسرا عضو، اسے بھی دوسری چیزوں کی مانند ایک ادراک اور احساس ہی ہونا چاہیے۔

خوابوں کے بارے میں دی جانے والی ایک مثال اس موضوع کو مزید واضح کردے گی۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اب تک ہم نے جو کچھ کہا اس کے مطابق ہم اپنے دماغ کے اندر ایک خواب دیکھتے ہیں۔ خواب میں ایک تصوّراتی جسم ہوتا ہے، ایک تصوّراتی بازو، تصوّراتی آنکھ اور ایک تصوّراتی دماغ۔ اگر ہم سے دورانِ خواب یہ سوال کیا جائے ''تم کہاں دیکھتے ہو؟'' ہم جواب دیں گے: ''میں اپنے دماغ میں دیکھتا ہوں''۔ حالانکہ کوئی ایسا دماغ تو وجود ہی نہیں رکھتا جس کا ذکر کیا جائے البتہ ایک تصوّراتی سر اور تصوّراتی دماغ ضرور موجود ہوتا ہے۔

ان ذہنی تصاویر کو دیکھنے والا عالمِ خواب کا تصوّراتی دماغ نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ایک ''اصلی وجود'' ہوتا ہے جو اس سے بہت زیادہ ''اعلیٰ و برتر'' ہوتا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ایک خواب کا تانا بانا اور وہ ترکیب و ترتیب جسے ہم حقیقی زندگی کہتے ہیں دونوں میں کوئی طبعی امتیاز نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب ہم سے اس عالمِ حقیقی میں، جسے ہم حقیقی زندگی کہتے ہیں درج بالا سوال ''تم کہاں دیکھتے ہو؟'' پوچھا جائے گا تو یہ جواب دینا کہ ''اپنے دماغ میں'' بے معنی ہوگا۔ جیسا کہ درج بالا مثال میں دیا گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ وجود جو دیکھتا اور ادراک

کرتا ہے دماغ نہیں ہے۔ جو گوشت کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔

جب ہم دماغ کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں سوائے شحمی اور لحمیاتی سالموں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ جو دوسرے جاندار نامیاتی اجسام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گوشت کا وہ ٹکڑا جسے ہم ''دماغ'' کہتے ہیں تصوراتی شبیہات کو دیکھنے کے لئے شعور وآگاہی یا اس وجود کو تخلیق کرنے کے لئے جسے ''میں خود'' (Myself) کہتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہے۔ دماغ میں جن تصوراتی شبیہات کا ادراک ہوتا ہے اس سے متعلق لوگ جو غلطی کرتے ہیں آر ایل گریگوری اس حوالہ سے یوں کہتا ہے:

انسان کو اس رغبت سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے جو یہ ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ آنکھیں دماغ کے اندر تصاویر بناتی ہیں۔ جو تصویر دماغ میں بنتی ہے وہ اس ضرورت کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی اندرونی آنکھ اسے دیکھنے والی ہونی چاہئے۔ مگر اس کی تصویر دیکھنے کے لئے مزید ایک آنکھ درکار ہوگی...... اور یہ سلسلہ جاری رہے گا جو آنکھوں اور تصاویر کی مراجعت پر ختم ہوگا۔ یہ بڑی مبہم سی بات لگتی ہے۔

یہی تو وہ بات ہے جو ان مادہ پرستوں کو، جو سوائے مادے کے کسی شے کو سچ نہیں سمجھتے، حیران و پریشان کر دیتی ہے۔ وہ ''اندرونی آنکھ'' کس کی ہوتی ہے، جو دیکھتی ہے اور ادراک کرتی ہے اس کا جو یہ دیکھتی ہے اور جس پر ردعمل کا اظہار کرتی ہے؟ Karl Pribram نے بھی دنیائے سائنس و فلسفہ میں اس اہم سوال پر توجہ مرکوز کی کہ مدرک (ادراک، احساس کرنے والا) کون ہے:

چونکہ یونانی فلسفی ''مشین میں بھوت''، ''چھوٹے سے انسان کے اندر ایک اور چھوٹا سا انسان'' وغیرہ کے بارے میں سوچتے رہے ہیں۔ وہ ''میں'' کہاں ہے۔ وہ شخص جو اپنا دماغ استعمال کرتا ہے؟ جاننے کے فعل کا احساس جس کو ہو جاتا ہے وہ کون ہے؟ جیسا کہ Assisi کے سینٹ فرانسس نے کہا:

''وہ جس کی ہمیں تلاش ہوتی ہے وہ دیکھنے والا ہوتا ہے''۔

اب اس بات پر غور کیجئے: وہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، کمرہ جس کے اندر آپ ہیں، مختصر یہ کہ وہ تمام تصوراتی شبیہات جو آپ کے سامنے ہیں وہ آپ کے دماغ کے اندر دیکھی جاتی ہیں۔ کیا یہ وہ جوہر (ایٹم) ہیں جو ان تصوراتی شبیہات کو دیکھتے ہیں؟ اندھے، بہرے، بے خبر اور بے شعور ایٹم؟ ایسا کیوں ہے کہ کچھ ایٹم یہ خصوصیت حاصل کر لیتے ہیں جبکہ کچھ نہیں کر سکتے؟ کیا
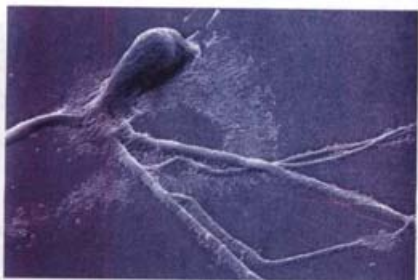
دماغ خلیوں کا ایک ڈھیر ہے جو لحمیات اور چربیلے سالموں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں عصبی خلیے ہوتے ہیں۔ اس گوشت کے ٹکڑے میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہوتی جس سے یہ تصوّراتی شبیہات دیکھ سکے، عقل وشعور اور باخبری پیدا کر سکے یا اس وجود کو تخلیق کر سکے جسے ہم "میں خود" کہتے ہیں۔

ہمارے سوچنے، سمجھنے، یاد رکھنے، خوش و ناخوش ہونے کے فعل اور ہر ایک شے ان ایٹموں میں پیدا ہونے والے برقیمائی (Electrochemical) ردعمل پر مشتمل ہوتی ہے۔

جب ہم ان سوالات پر غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان ایٹموں میں مرضی و ارادے کی تلاش کوئی عقلمندی تو نہیں ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو وجود دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے وہ ماورائے مادہ کوئی وجود ہے۔ یہ وجود "زندہ" ہے اور یہ نہ مادہ ہے نہ مادے کی تصوّراتی شبیہ۔ یہ وجود ان ادراک کے ساتھ مل جاتا ہے جو اس کے سامنے ہوتے ہیں اور اس کے لئے وہ ہمارے جسم کی تصوّراتی شبیہ استعمال کرتا ہے۔

یہ وجود "رُوح" ہے۔ ادراک کا مجموعہ جسے ہم "مادی دنیا" کہتے ہیں وہ خواب ہے جسے روح دیکھتی ہے۔ جس طرح وہ جسم جو ہمارے پاس ہے اور وہ مادی دنیا جسے ہم خواب میں دیکھتے ہیں، کی کوئی اصلیت نہیں اسی طرح وہ کائنات جو ہمارے پاس ہے اور جسم جو ہم رکھتے ہیں کی بھی کوئی مادی حقیقت نہیں ہے۔

اصل وجود تو روح کا ہے۔ مادہ تو محض ان ادراک پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں روح دیکھتی ہے۔ وہ ذہین لوگ جو یہ سطور لکھتے اور پڑھتے ہیں ان میں سے ہر ایک ایٹموں اور سالموں اور اس کیمیائی ردعمل کا ڈھیر نہیں ہے جو ان کے درمیان پیدا ہوتا ہے بلکہ ایک "روح" ہے۔

حقیقی قادر مطلق

یہ تمام حقائق ہمیں ایک نہایت اہم سوال کے روبرو لا کھڑا کرتے ہیں۔ اگر وہ مادی دنیا

جسے ہم تسلیم کرتے ہیں محض ان ادراک پر مشتمل ہے جنہیں ہماری روح دیکھتی ہے تو پھر ان ادراک کا منبع وماخذ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے وقت ہمیں درج ذیل حقیقت پر غور کرنا ہوگا: مادے کے وجود میں قوت خود اختیاری نہیں ہوتی۔ مادہ چونکہ ایک ادراک ہے، یہ ایک ''مصنوعی'' شے ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ادراک کسی اور طاقت نے پیدا کیا ہے یعنی اسے کسی نے ضرور تخلیق کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس تخلیق کو تسلسل کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اگر یہ تخلیق لگاتار اور تسلسل کے ساتھ نہ ہو تو پھر جسے ہم مادہ کہتے ہیں غائب اور معدوم ہو جائے گا۔ اس کی مثال ایک ٹیلی ویژن سے دی جاسکتی ہے جس پر تصویر اس وقت تک آتی رہتی ہے جب تک ایک اشارہ نشر ہوتا رہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جو ہماری روح کو وہ ستارے، زمین، سیارے، لوگ، ہمارا جسم اور ہر ایک شے دکھاتا ہے جسے ہم دیکھتے ہیں؟

یہ بات بالکل واضح اور عیاں ہے کہ ایک خالق عظیم موجود ہے، جس نے پوری مادی کائنات تخلیق کی ہے جو ادراک کا لب لباب ہے۔ اور جو ہستی کہ لگاتار اپنی تخلیق جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ خالق اس قدر حسین وجمیل مخلوق تخلیق کر رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اس کی دائمی قوت وطاقت ہے یہ خالق اپنا تعارف خود ہم سے کراتا ہے۔ اس نے حیات کی کائنات کے اندر ایک کتاب تخلیق کی ہے۔ اسی نے یہ کتاب تخلیق کی، اور اس کتاب کے ذریعے اپنے بارے میں ہمیں بتایا، کائنات کے بارے میں بتایا اور ہمیں ہماری وجہ تخلیق سے آگاہ کیا۔

اس خالق کا نام اللہ ہے اور اس کی کتاب قرآن پاک ہے۔ یہ حقائق کہ آسمان وزمین یعنی کائنات پائیدار نہیں ہے اور ان کی موجودگی کو صرف اللہ کی تخلیق نے ممکن بنایا ہے اور جب وہ اس تخلیق کو ختم کردے گا تو یہ سب کچھ مٹ جائے گا۔ اس ساری بات کا ذکر قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں بیان فرما دیا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ج وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ م بَعْدِهِ ط إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ○

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا اُنہیں تھامنے والا نہیں ہے۔ بیشک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے''۔ (سورہ فاطر:۴۱)

جیسا کہ ہم ابتدائی صفحات میں بتا چکے ہیں کچھ لوگ اللہ کے بارے میں صحیح علم نہیں رکھتے اور اسی لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہیں آسمانوں میں رہتا ہے اور دنیاوی معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ اس منطق کی بنیاد دراصل اس تصور میں پوشیدہ ہے کہ یہ کائنات مادے کے باہم مل جانے سے وجود میں آئی ہے اور اللہ اس مادی دنیا سے "باہر" ایک دور دراز مقام پر رہتا ہے۔ چند جھوٹے مذاہب میں اللہ کا عقیدہ اس سمجھ بوجھ تک محدود ہے۔

تاہم جیسا کہ ہم نے اب تک اس بات پر غور وفکر کیا مادہ صرف حواس (Sensations) سے ترکیب پا کر وجود میں آیا ہے۔ اور واحد قادر مطلق اللہ کی ذات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ ہی ہے جو موجود ہے: ماسوا اللہ کے ہر شے ایک سایہ ہے پرچھائیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس مادے کے انبار سے باہر اللہ تعالیٰ کے ایک الگ وجود کا ادراک کرنا ناممکن ہے۔ اللہ یقیناً "ہر کہیں ہے" اور ہر شے پر محیط ہے۔ اس حقیقت کو قرآن پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے"۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۵)

یہ حقیقت کہ اللہ کسی مکاں تک محدود نہیں ہے اور یہ کہ وہ کائنات کی ہر شے پر محیط ہے، اسے قرآن پاک میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝

''مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں جس طرف بھی رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رخ ہے، اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔(سورۃ البقرۃ:۱۱۵)

چونکہ ہر مادی شے ایک ادراک ہے اس لئے وہ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی لیکن وہ مادے کو دیکھ سکتا ہے کہ اس نے اسے اس کی تمام صورتوں میں تخلیق کیا ہے۔قرآن پاک میں اس حقیقت کا ذکر یوں آیا ہے:

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ

''اس کی نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے''۔(سورۃ الانعام:۱۰۳)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمارے ظاہر و باطن یہاں تک کہ نگاہوں اور خیالات تک پر پوری طرح محیط ہے۔اس کے علم کے بغیر ہم ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتے نہ ہی ایک سانس تک لے سکتے ہیں۔

جب ہم اپنی زندگی میں ان حسی ادراک کو دیکھتے ہیں تو ان احساسات میں سے قریب ترین کوئی ایک بھی نہیں ہوتا ہاں مگر اللہ ہمارے قریب ترین رہتا ہے (ہماری شہ رگ سے بھی قریب) اس حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کا راز پوشیدہ ہے:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِo

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں''۔(سورۃ ق:۱۶)

فَلَوۡلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الۡحُلۡقُوۡمَ o وَاَنۡتُمۡ حِيۡنَئِذٍ تَنۡظُرُوۡنَ o وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُبۡصِرُوۡنَ o

''تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے''۔
(سورۃ الواقعہ:۸۵-۸۳)

جب ایک انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کا جسم ''مادے'' سے بنا ہے تو پھر وہ اس اہم حقیقت کو سمجھ نہیں پاتا۔اگر وہ اپنے دماغ کو ''وہ خود'' تصور کرتا ہے تو پھر باہر کے جس مقام کو وہ تسلیم کرتا ہے وہ اس سے ۳۰-۲۰ سینٹی میٹر دور ہوگا۔تاہم جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ مادے کی قسم کی کوئی شے نہیں ہے اور ہر شے ایک تصور ہے، واہمہ و خیال ہے مثلاً باہر، اندر قریب اپنے معانی کھو دیتے ہیں۔اللہ اس پر محیط ہے اور وہی

جو کچھ یہاں کہا گیا ہے اگر کوئی انسان اس پر غور وفکر کرے تو یہ حیرت انگیز اور غیر معمولی صورت حال خود بخود اس کی سمجھ میں آجائے گی: کہ اس دنیا میں پیش آنے والے تمام واقعات محض خیالی ہیں۔

ذات بے ہمتا اس کے ''بے انتہا قریب'' ہے۔

اللہ انسانوں کو اس آیت قرآنی کے ذریعے مطلع فرماتا ہے کہ وہ ان کے ''بے انتہا قریب'' ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط

''اور اے نبیؐ میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں''۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۶)

ایک اور آیت میں اسی حقیقت کا ذکر یوں فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ○

''اے نبیؐ ان سے کہو میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں۔ کوئی حقیقی معبود نہیں مگر اللہ جو یکتا ہے سب پر غالب، آسمانوں اور زمین کا مالک اور اور ان ساری چیزوں کا مالک جو ان کے درمیان ہیں''۔ (سورۃ ص:۶۶-۶۵)

انسان نے یہ سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے کہ وہ جو اس کے قریب ترین ہے یہ وہ خود ہے۔ اللہ تو ہم سے ہماری نسبت بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہماری توجہ اس آیت کی جانب مبذول کراتا ہے:

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝

"تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے"۔ (سورۃ الواقعہ: ۸۵-۸۳)

جیسا کہ اس سورۃ میں مطلع کیا گیا مدرک بالحواس حقیقت سے بے خبر ہو کر زندگی گزارتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔

دوسری طرف انسان جو ایک ظلی وجود رکھتا ہے، اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اللہ کے بغیر کوئی قوت یا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو کچھ بھی ہمیں پیش آتا ہے وہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہوتا ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

"حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو"۔ (سورۃ الصّٰفّٰت: ۹۶)

قرآن کی ایک اور سورۃ میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ

"اور اے نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا، اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے"۔ (سورۃ الانفال: ۱۷)

اس سے یہ مراد ہے کہ کوئی کام اللہ کی مرضی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ انسان چونکہ ایک ظلی وجود رکھتا ہے اس لئے پھینکنے کا کام وہ خود نہیں کر سکتا۔ تاہم اللہ اس وجود ظلی کو خود کا احساس عطا کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اللہ ہی ہے جو تمام کام پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کسی کام کو کرنے لگتا ہے تو وہ ایسا اپنے طور پر کرتا ہے، وہ بظاہر اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے۔ ایک انسان کبھی یہ نہ چاہے گا کہ اسے تسلیم کرلے اور اپنے بارے میں وہ یہ

سوچ سکتا ہے کہ وہ اللہ سے جدا رہ کر خود مختار ہے مگر اس سے کوئی شے تبدیل تو نہیں ہو جاتی۔ بیشک اس کا یہ احمقانہ انکار بھی ایک بار پھر اللہ کی مرضی وارادے کے تابع ہوگا۔

آپ کی ہر شے فی نفسہٖ خیالی ہے

جیسا کہ یہ بات بالکل واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے کہ یہ ایک سائنسی اور منطقی حقیقت ہے کہ ''خارجی دنیا'' کی کوئی مادی اصلیت نہیں ہے اور یہ ان خیالی تصاویر کا مجموعہ ہے جسے اللہ ہماری روح کو مسلسل عنایت کرتا رہتا ہے۔ تاہم لوگ عموماً ''خارجی دنیا'' کے تصور میں ہر شے کو شامل نہیں کرتے یا شامل کرنا نہیں چاہتے۔ اگر آپ اس مسئلے پر مخلصانہ اور جرأت مندانہ غور وفکر کریں تو آپ کو یہ احساس ہونے لگے گا کہ آپ کا گھر، اس کا فرنیچر، آپ کی کار غالباً جو آپ نے حال ہی میں خریدی ہے، دفتر، زیورات، بینک میں رکھی ہوئی رقم، کپڑوں کی الماری، آپ کی اہلیہ، بچے، رفقاء اور ہر وہ شے جو آپ کی ملکیت ہے دراصل اس تصوراتی دنیا میں شامل ہے جسے آپ اپنی نظروں کے سامنے دیکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر وہ شے جسے آپ دیکھتے، سنتے یا سونگھتے ہیں آپ اس کا ادراک اپنے حواس سے کرتے ہیں۔ یہ دراصل اس تصوراتی دنیا کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جس میں آپ کے پسندیدہ گلوکار کی آواز، اس کرسی کی سخت سطح جس پر آپ بیٹھتے ہیں، عطر جس کی خوشبو آپ پسند کرتے ہیں، وہ سورج جو آپ کو گرم رکھتا ہے، ایک رنگین خوبصورت پھول، آپ کی کھڑکی کے سامنے اڑنے والا ایک پرندہ، پانی کی لہروں پر تیرتی ایک تیز رفتار کشتی، آپ کا زرخیز سرسبز باغیچہ، وہ کمپیوٹر جسے آپ کام کے دوران استعمال کرتے ہیں یا آپ کا ''ہائی فائی (Hi-fi) جس کی ٹیکنالوجی دنیا بھر کی جدید ترین ٹیکنالوجی ہے، سبھی کچھ شامل ہے۔

یہ حقیقت ہے کیونکہ دنیا تو صرف ان تصوراتی تصویروں کا مجموعہ ہے جسے انسان کی آزمائش کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ انسانوں کو محدود عمر کے دوران ان ادراکات سے آزمایا جاتا ہے جو کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کو دانستہ طور پر دلکش اور خوشنما بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○

"لوگوں کے لئے مرغوباتِ نفس...... عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی، اور زرعی زمینیں...... بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے"۔ (سورۃ آل عمران ۱۴:)

بہت سے لوگ جائیداد، دولتِ دنیا، سونے چاندی کے انبار، ڈالر، ہیرے جواہرات، بنک میں جمع شدہ رقوم، کریڈٹ کارڈ، قیمتی ملبوسات سے بھری ہوئی الماریاں، جدید ماڈل کی کاروں، مختصر یہ کہ عیش وعشرت کے اس سامان کی خاطر جوان کے پاس موجود ہے یا جسے حاصل کرنے کی وہ کوشش کررہے ہیں، مذہب کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور وہ حیات بعد ممات کو بالکل فراموش کر کے اپنی ساری توجہ اسی دنیا کی زندگی کو دینے لگتے ہیں۔ وہ اس دنیا کی زندگی کے "خوبصورت اور دل لبھانے والے" چہرے سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس طرح وہ نماز ادا کرنے میں ناکام رہتے ہیں، غربا ومساکین کی مدد نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کی عبادت کرتے ہیں جوان کے لئے آخرت کی زندگی کی آسودگی کی ضمانت بن سکتی تھی۔ انہیں یہ کہتے سنا گیا ہے "مجھے بہت سے کام کرنا ہیں"، "میرے کچھ خواب ہیں"، "میری بہت سی ذمہ داریاں ہیں"، "میرے پاس کافی وقت نہیں ہے"، "مجھے کئی کام مکمل کرنے ہیں"، "میں یہ مستقبل میں کرلوں گا"۔ وہ صرف اس دنیا کی زندگی میں خوشحال ہونے کے لئے پوری عمریں گزار دیتے ہیں۔ درج ذیل آیت میں اس غلط فہمی کا ذکر فرمایا گیا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ○

"لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں"۔ (سورۃ الروم:۷)

اس باب میں ہم جس حقیقت کا ذکر کرنے والے ہیں کہ ہر شے ایک خیالی شبیہ ہے، یہ اس حوالے سے بے حد اہم ہے کیونکہ اس کے اطلاق سے تمام حرص ولالچ کی حدود بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کی تصدیق اسے عیاں کردیتی ہے کہ ہر وہ شے جو لوگوں کے پاس ہے یا جسے حاصل کرنے کی وہ سعی وکوشش کرتے ہیں، وہ دولت جسے انہوں نے حریصانہ جمع کیا، ان کی اولاد جس پر وہ نازاں ہیں، ان کی بیگمات جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ان کے بہت قریب ہیں، ان کے دوست، وہ جن سے انہیں بڑا پیار ہے، ان کے عہدے جن کی وجہ سے ان کو بلند مقام

ومرتبہ حاصل ہے، وہ مشہور درسگاہیں جہاں انہوں نے تعلیم پائی ہے اور آرام کی خاطر ان کی تعطیلات سوائے ایک پرفریب خیال کے کچھ بھی تو نہیں ہیں۔ اس لئے اس سمت کی جانے والی تمام تر کوششیں وقت جو گزارا گیا اور وہ حرص جس سے کام لیا گیا بے سود اور بے ثمر ثابت ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ جب اپنے مال و دولت، جائیدادوں اور اپنے ''بجروں (بادبانی کشتیوں)، ہیلی کاپٹروں، کارخانوں، مال واسباب، حویلیوں، جاگیروں اور زمینوں پر غور کرتے ہیں تو دراصل وہ نادانستہ طور پر اپنے آپ کو احمق بنا رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ سب کچھ واقعی موجود تھا۔ وہ متمول افراد جو اپنی بادبانی کشتیوں میں نمود و نمائش کے طور پر سیر و تفریح کرتے ہیں، اپنی نہایت قیمتی کاریں دوسروں کو دکھا دکھا کر اتراتے ہیں، اپنی دولت کا ذکر کرتے نہیں تھکتے، یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا بڑا عہدہ ہر دوسرے انسان سے ان کو بلند مقام پر بٹھانے کے لئے کافی ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اس سب کچھ کی موجودگی میں وہ ایک کامیاب انسان ہیں۔ انہیں دراصل یہ سوچنا چاہئے کہ اگر ان کو ایک بار یہ احساس ہو جائے کہ ان کی یہ کامیابی سوائے ایک پرفریب خیال کے کچھ نہیں تو پھر ان کی کیا حالت ہوگی؟

درحقیقت ایسے مناظر خوابوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے خوابوں میں بھی عالیشان گھر، تیز رفتار کاریں، نہایت قیمتی ہیرے جواہرات، ڈالروں کے بنڈل، سونے چاندی کے انبار دیکھتے ہیں۔ خوابوں میں بھی وہ اپنے آپ کو اعلیٰ عہدے پر فائز دیکھتے ہیں، ان کے کارخانے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہوں یہ بہت سے لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے طاقت رکھتے ہیں، ان کے جسم پر ایسا لباس ہوتا ہے جسے دیکھ کر ہر کوئی ان کی تعریف کرے......جس طرح خوابوں میں اپنے مال واسباب پر فخر کرنے والے کا تمسخر اڑایا جاتا ہے اسی طرح حقیقی دنیا میں بھی محض خیالی چیزوں پر فخر کرنے پر بھی ایسے انسان کا مذاق اڑایا جائے گا۔ دراصل جو وہ اپنے خوابوں میں دیکھتا ہے اور جس کا ذکر وہ اس دنیا میں کرتا ہے دونوں وہ خیالی تصویریں ہیں جو اس کے ذہن میں ہوتی ہیں۔

اسی طرح جب لوگ ان واقعات پر ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جو انہیں دنیا میں پیش آتے ہیں تو وہ اس پر بھی اس وقت شرمندگی وندامت محسوس کرتے ہیں جب ان کو حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ جو خوفناک طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں وہ جو غضبناک ہو جاتے ہیں، جو چکمہ دیتے ہیں، جو رشوت لیتے ہیں، جو جعلسازی سے کام لیتے ہیں، جو جھوٹ بولتے ہیں، جو حریصانہ دولت جمع کرتے ہیں، جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں، جو دوسروں کو مارتے پیٹتے اور لعن

طعن کرتے ہیں، جو غصے میں ظلم و تشدد پر اتر آتے ہیں، وہ جن کو اپنے عہدے اور منصب پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے، جو حاسد ہوتے ہیں، جو نمود و نمائش کی کوشش کرتے ہیں، وہ جو اپنے آپ کو مقدس و پاکیزہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب انہیں پتہ چلے گا کہ انہوں نے یہ سب کچھ عالم خواب میں کیا ہے تو وہ کس قدر ذلیل اور بے عزت ہوں گے۔

اللہ ہی ان تمام خیالی شبیہات کو تخلیق کرتا ہے، ہر شے کا اصل مالک بلا شرکت غیرے اللہ ہی ہے۔ اس حقیقت پر قرآن پاک میں بڑا زور دیا گیا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ۝

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے''۔ (سورۃ النساء: ۱۲۶)

خیالی جذبات کی خاطر مذہب کو پس پشت ڈال دینا اور یوں اس ابدی زندگی کو کھو دینا جو ایک ہمیشہ کی محرومی ہوتی ہے، بہت بڑی حماقت ہے۔

اس مرحلے میں ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے: یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ حقیقت جس کا سامنا آپ کرتے ہیں اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ ''تمام مال و اسباب، روپیہ پیسہ، اولاد، بیویاں، دوست احباب، اور عہدہ جس پر آپ متمکن ہیں سب جلد یا بدیر ختم ہو جائیں گے اس لئے یہ بے معنی ہیں''۔ بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ ''وہ تمام مال و اسباب جو بظاہر آپ کے پاس ہے دراصل کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ یہ محض ایک خواب ہے اور یہ ان خیالی تصویروں پر مشتمل ہے جو اللہ تمہاری آزمائش کے لئے تمہیں دکھا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دونوں بیانات کے درمیان کتنا بڑا فرق ہے۔

حالانکہ انسان فی الفور اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا اور وہ یہ فرض کر کے اپنے آپ کو دھوکہ دے گا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ فی الحقیقت وجود رکھتا ہے اور اسے بالآخر ایک روز مرنا ہے اور جب قیامت کے روز اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو ہر بات واضح ہو جائے گی۔ اس روز کے حوالے سے سورۃ ق کی آیت ۲۲ میں فرمایا گیا کہ ''آج تیری نگاہ خوب تیز ہے''۔ اور وہ ہر شے کو زیادہ سے زیادہ صاف اور واضح طور پر دیکھ سکے گا۔ تاہم اگر اس نے پوری عمر خیالی مقاصد کے تعاقب میں گزار دی تو وہ یہ خواہش کرے گا کہ کاش اس نے یہ زندگی گزاری ہی نہ ہوتی۔ وہ کہے گا: ''کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام

نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا''۔

اس کے برعکس ایک دانا آدمی کیا کرے گا، وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے جس وقت ابھی اسے مہلت حاصل ہو گی کائنات کی عظیم ترین حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے گا۔ وگرنہ عمر بھر خوابوں کے پیچھے دوڑتا رہے گا اور آخرت میں اسے ایک افسوسناک سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ جو دنیا میں سرابوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور اپنے خالق کو بھلا بیٹھتے ہیں ان کی آخری حالت کے بارے میں قرآن پاک میں اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ط حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ط وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ o

''(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی''۔ (سورۃ النور:۳۹)

آپ کے لئے حقیقت صرف وہ ہے جسے آپ ''ہاتھ سے چھو سکتے ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہوں'' مگر اصل میں تو نہ آپ کا ہاتھ ہے نہ آنکھ نہ کوئی ایسی شے موجود ہے جسے چھوا دیکھا جا سکتا ہو۔ سوائے آپ کے دماغ کے کوئی ایسی مادی حقیقت نہیں ہے جو ان چیزوں کو ظہور پذیر ہونے دیتی ہے۔ آپ کو تو دھوکہ دیا جا رہا ہوتا ہے۔

وہ کیا ہے جو حقیقی زندگی اور خوابوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے؟ بالآخر زندگی کی دونوں شکلیں دماغ کے اندر ایک وجود پاتی ہیں۔ اگر ہم اپنے خوابوں میں ایک غیر حقیقی دنیا میں آرام وآسانی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں تو یہی بات اس دنیا کے لئے بھی یکساں طور پر درست ہو سکتی ہے جس میں ہم زندگی گزارتے ہیں۔ جب ہم خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے کہ ہم ایک طویل خواب میں داخل ہو گئے ہیں جسے ہم ''حقیقی زندگی'' کا نام دیتے ہیں۔ ہم اپنے خواب کو ایک خیال تصور کرتے ہیں اور اس دنیا کو حقیقی، اس کی وجہ کوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہماری عادات اور تعصبات کی پیداوار ہوتی ہے۔

اس سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ ہم اس زمین پر رہتے ہوئے زندگی سے بھی اُسی طرح بیدار

ہو سکتے ہیں، جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اسے گزار رہے ہیں، جس طرح کہ ہم ایک خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

مادہ پرستوں کی منطقی خامیاں

اس باب کے آغاز ہی میں اس بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ مادہ، جیسا کہ مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے، ایک مطلق وجود نہیں ہے بلکہ ان حواس (Senses) کا مجموعہ ہے جن کا خالق اللہ ہے۔ مادہ پرست ایک نہایت آمرانہ طریقے سے اس عیاں حقیقت سے انکار کرتے ہیں، جو ان کے فلسفے کو تباہ کر دیتی ہے اور ایک بے بنیاد جواب دعویٰ پیش کرتی ہے۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے مادہ پرست فلسفے کے سب سے بڑے حامی اور مارکسی نظریے کے پرجوش حمایتی جارج پولائزر نے مادے کے وجود کے لئے "بس کی مثال" دی اور اسے بطور سب سے بڑے ثبوت کے پیش کیا۔ پولائزر کے خیال میں وہ فلسفی جو یہ سمجھتے ہیں کہ مادہ ایک ادراک ہے، جب بس دیکھتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں اور یہ مادے کی طبعی موجودگی کا ثبوت ہے۔

جب ایک اور مشہور مادہ پرست جانسن کو بتایا گیا کہ مادہ ادراکات کا مجموعہ ہے تو اس نے پتھروں کے مادی وجود کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش میں انہیں ٹھوکر ماری تھی۔

ایسی ہی ایک مثال Friedrich Engels نے دی جو پولائزر کا استاد اور مارکس کے ساتھ جدلیاتی مادہ پرستی کا بانی تھا، جس نے لکھا کہ "اگر وہ کیک جو ہم کھاتے ہیں محض ادراکات تھے تو ان سے ہماری بھوک نہ مٹنی چاہئے تھی"۔

اسی قسم کی مثالیں اور تند و تیز جملے "جب آپ کے چہرے پر تھپڑ رسید ہوتا ہے تو آپ مادے کی موجودگی سمجھ جاتے ہیں" مشہور مادہ پرستوں مثلاً مارکس، انجلز، لینن اور دوسروں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

جب اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے تو اس سے مادہ پرستوں کی ان مثالوں کو راستہ مل جاتا ہے جو اس وضاحت کو ان الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں "مادہ ایک ادراک ہے" جس طرح کہ "مادہ روشنی کا فریب نظر ہے"۔ ان کے خیال میں ادراک کا نظریہ صرف دیکھنے تک محدود ہے اور چھونے کے ادراکات ایک طبعی رابطہ رکھتے ہیں۔ ایک بس جب کسی آدمی کو ٹکر مار کر گرا دیتی ہے تو یہ ان کے منہ

سے یہ کہلواتی ہے ''دیکھو اس نے آدمی کو کچل دیا ہے اس لئے یہ ادراک نہیں ہے''۔ جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ بس کے تصادم کے دوران جتنے ادراکات کا تجزیہ ہوا مثلاً سختی، ٹکراؤ اور درد، یہ سب دماغ کے اندر متشکل ہوئے ہیں۔

خوابوں کی مثال

اس حقیقت کی تشریح کرنے کے لئے بہترین مثال خواب ہیں۔ ایک انسان عالم خواب میں بے حد حقیقی واقعات کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ زینے سے لڑھک سکتا ہے جس میں اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کا کار کا شدید حادثہ ہو سکتا ہے، وہ ایک بس کے نیچے آ سکتا ہے، یا وہ ایک کیک کھاتا ہے، جس سے وہ شکم سیری محسوس کرتا ہے۔ ویسے ہی واقعات، جیسے ہمیں روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں خواب میں بھی پیش آ سکتے ہیں جن میں ویسی ہی ترغیب ملتی ہے اور ہمارے اندر ویسے ہی جذبات ابھرتے ہیں۔

ایک ایسا انسان جو خواب میں دیکھتا ہے کہ اسے ایک بس نے ٹکر مار کر گرا دیا ہے جب آنکھ کھولتا ہے تو ایک بار پھر خواب ہی میں اپنے آپ کو ہسپتال میں پاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ معذور ہو گیا ہے مگر یہ سب باتیں عالم خواب کی ہوں گی وہ یہ خواب بھی دیکھ سکتا ہے کہ وہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے اور موت کے فرشتے اس کی روح لے جاتے ہیں اور اس کی آخرت کی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

انسان خیالی تصویروں، آوازوں، سختی کے احساس، روشنیوں رنگینیوں اور خواب میں پیش آنے والے واقعہ سے متعلق تمام دوسرے احساسات کے تجربات کا ادراک بڑی تیزی کے ساتھ کرتا ہے۔ جن ادراکات کا تجزیہ اسے خواب میں ہوتا ہے وہ اسی طرح قدرتی ہوتے ہیں جس طرح ''حقیقی'' زندگی میں۔ جو کیک وہ خواب میں کھاتا ہے وہ حالانکہ محض ایک ادراک ہوتا ہے مگر وہ سیر شکم ہو جاتا ہے اس لئے کہ سیر شکمی بھی ایک ادراک ہے۔ تاہم حقیقت میں یہ انسان اس وقت اپنے بستر میں لیٹا ہوا ہوتا ہے۔ نہ تو کوئی زینہ ہوتا ہے، نہ ٹریفک نہ بسیں جن پر غور کیا جا سکے۔ خواب دیکھنے والا انسان ان ادراکات اور احساسات کے تجربے سے گزرتا ہے جو خارجی دنیا میں وجود نہیں رکھتے۔ یہ حقیقت کہ ہم اپنے خوابوں میں ان واقعات کے تجربے سے گزرتے ہیں، دیکھتے ہیں، اور انہیں محسوس کرتے ہیں جن کا خارجی دنیا سے کوئی طبعی رابطہ نہیں ہوتا۔ اس سے

خوابوں کی دنیا

آپ کے لئے حقیقت وہ ہے جسے آپ ہاتھ سے چھو سکتے ہیں، اور آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ اپنے خواب میں بھی "اپنے ہاتھ سے چھو سکتے ہیں اور اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں"۔ لیکن درحقیقت نہ آپ کا ہاتھ ہوتا ہے نہ آنکھ نہ کوئی ایسی شے ہوتی ہے جسے چھوا یا دیکھا جا سکتا ہو۔ کوئی مادی حقیقت بھی ایسی نہیں ہوتی جو ان چیزوں کو وقوع پذیر ہونے دے ماسوا آپ کے دماغ کے۔ آپ کو تو دراصل فریب دیا جا رہا ہوتا ہے۔

وہ کیا شے ہے جو حقیقی زندگی اور خوابوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے؟ بالآخر دونوں طرح کی زندگی کی شکلوں کو دماغ کے اندر لایا جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے خوابوں میں ایک غیر حقیقی دنیا میں بآسانی رہ سکتے ہیں تو یہی بات اس دنیا کے لئے بھی یکساں طور پر صحیح ہو سکتی ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ جب ہم خواب سے جاگتے ہیں تو اس کے لئے ہمارے پاس کوئی منطقی دلیل نہیں ہوتی کہ ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے کہ ہم ایک طویل خواب میں داخل ہو گئے ہیں جسے ہم "حقیقی زندگی" کا نام دیتے ہیں۔ ہم اپنے خواب کو ایک خیال تصور کرتے ہیں اور اس دنیا کو حقیقی، اس کی وجہ کوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہماری عادات اور تعصبات کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ ہم اس زمین پر رہتے ہوئے زندگی میں بھی اسی طرح بیدار ہو سکتے ہیں جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اسے گزار رہے ہیں، جس طرح کہ ہم ایک خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

(یہ تجربہ اسی طرح سے اس دنیا کی حقیقی زندگی میں بھی پیش آتا ہے جو ایک خواب کی مانند ایک ادراک ہے)

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "خارجی دنیا" محض ادراکات پر مشتمل ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو مادہ پرستانہ فلسفے میں، بالخصوص مارکسی اس وقت غصے میں آ جاتے ہیں جب انہیں اس حقیقت کے بارے میں بتایا جاتا ہے، جو مادے کا جوہر ہے۔ وہ مارکس، اینجلز یا لینن کے سطحی دلائل میں سے مثالیں پیش کرتے ہیں اور جذباتی اعلانات کرتے ہیں۔

تاہم ان افراد کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ وہ یہی اعلانات اپنے خوابوں میں بھی کر سکتے ہیں۔

وہ اپنے خواب میں ''داس کیپٹا'' (مارکس کی مشہور کتاب) کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں، اجلاس میں شرکت کر سکتے ہیں، پولیس سے لڑ سکتے ہیں، ان کے سر میں چوٹ لگ سکتی ہے اور مزید یہ کہ وہ اپنے زخموں کا درد بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ جب ان سے خواب ہی میں کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جس تجربے سے وہ خواب کے دوران گزرے ہیں وہ ''مطلق مادے'' پر مشتمل ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ ان اشیاء کو سمجھتے ہیں جنہیں وہ جاگتے میں دیکھتے ہیں اور جو ''مطلق مادہ'' ہوتی ہیں۔ تاہم یہ سب ان کے خواب کا معاملہ ہو یا روزمرہ زندگی کا، وہ سب کچھ جس کے تجربے سے یہ لوگ گزرتے ہیں دیکھتے ہیں، یا محسوس کرتے ہیں صرف ادراکات پر مشتمل ہوتا ہے۔

رگوں کو ایک دوسرے کے متوازی جوڑنے کی مثال

آیئے اب پولائزر کی دی گئی کار کے حادثے والی مثال پر غور کرتے ہیں: اگر اس حادثے میں کچلے جانے والے انسان کی ان رگوں کو جو اس کے حواس خمسہ سے دماغ کی جانب جا رہی تھیں، ایک دوسرے انسان کی رگوں کے ساتھ جوڑ دیا جائے، مثال کے طور پر پولائزر کے دماغ کی رگوں سے، اور انہیں ایک دوسرے کے متوازی جوڑا گیا ہو، نیز ایسا اسی لمحے کر لیا جائے جس وقت بس نے اس شخص کو ٹکر ماری ہے تو یہ بس پولائزر کو بھی ٹکر مار دے گی۔ ہم اسے مزید بہتر طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ حادثے کا شکار ہونے والا شخص جن تجربات سے گزرا ہے وہی پولائزر کو بھی پیش آئیں گے۔ بالکل ویسے ہی جس طرح ایک ہی گیت کو بیک وقت دو لاؤڈ سپیکروں پر ایک ہی ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ جوڑ کر سنا جا سکتا ہے۔ پولائزر محسوس بھی کرے گا، دیکھے گا اور بس کے بریک لگانے کی آواز کو سننے کے تجربے سے بھی گزرے گا۔ بس کو اپنے جسم سے ٹکراتے محسوس کرے گا، ٹوٹے ہوئے بازو اور بہتے خون، ٹوٹی ہوئی ہڈی کے درد کی خیالی تصویریں اس کے تجربے میں آئیں گی۔ آپریشن تھیٹر میں اپنے داخل ہونے، پلستر کی سخت سطح اور اپنے بازو کی کمزوری کی خیالی تصویریں دیکھے گا۔

پولائزر کی طرح ہر وہ انسان جس کی رگوں کو زخمی کی رگوں کے ساتھ متوازی حالت میں جوڑ دیا گیا ہو، اسی تجربے سے گزرے گا۔ اگر حادثے میں زخمی ہونے والا طویل بے ہوشی (Coma) میں چلا جاتا ہے تو وہ سب کے سب اسی حالت میں چلے جائیں گے۔ مزید یہ کہ کار کے حادثے

کے تمام ادراکات کو اگر ایک ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کر لیا جائے اور پھر انہیں ایک دوسرے انسان تک ارسال کیا جائے تو بس اس شخص کو کئی بار ٹکر مار کر گرائے گی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان افراد کو ٹکر مارنے والی بسوں میں سے اصلی بس کون سی ہوگی؟ مادہ پرستانہ فلسفے کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ تمام افراد اس کار کے حادثے کی جزئیات سمیت اس تجربے سے گزریں گے۔

یہی اصول کیک اور پتھر والی مثالوں پر لاگو ہوتا ہے۔ اگر انجلز کے حسی اعضاء کی رگیں جنہوں نے کیک کے کھائے جانے کے بعد پیٹ میں سیر شکمی محسوس کی متوازی حالت میں ایک دوسرے انسان کے دماغ کی رگوں سے جوڑ دی جائیں تو وہ شخص بھی اس وقت سیر شکمی محسوس کرے گا جب انجلز نے کیک کھایا تھا۔ اگر جانسن کی رگوں کو جس کے پاؤں میں اس وقت درد تھا جب اس نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری تھی، متوازی حالت میں ایک دوسرے انسان کی رگوں سے جوڑ دیا جائے تو وہ شخص جانسن کی طرح درد محسوس کرے گا۔

تو پھر کون سا کیک اور پتھر اصلی ہوا؟ مادہ پرستانہ فلسفہ ایک بار پھر اس سوال کا جواب دینے میں ناکام ہو جائے گا۔ اس سوال کا درست جواب یہ ہے:

انجلز اور دوسرے انسان دونوں نے اپنے اپنے ذہنوں میں کیک کھایا ہے اور سیر شکمی محسوس کی ہے؛ جانسن اور دوسرے انسان دونوں نے اپنے اپنے ذہنوں میں پتھر کو ٹھوکر مارنے پر درد محسوس کرنے کا تجربہ ایک ہی لمحے کیا ہے۔

پولائزر کے متعلق جو مثال ہم نے دی آیئے اس میں ایک تبدیلی کر لیں۔ ہم بس سے زخمی ہونے والے انسان کے دماغ کی رگوں کو پولائزر کے دماغ کی رگوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور پولائزر جو اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے کے دماغ کی رگوں کو اس انسان کے دماغ کی رگوں کے ساتھ جسے بس نے ٹکر ماری ہے۔ اس بار پولائزر حالانکہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے مگر پھر بھی وہ سوچے گا کہ بس نے اسے ٹکر ماری ہے اور جو انسان واقعی بس سے ٹکرایا ہے اسے یہ خیال کبھی نہیں آئے گا کہ وہ حادثے کا شکار ہوا ہے اور وہ یہ سمجھے گا کہ پولائزر کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہی منطق اور استدلال کیک اور پتھر والی مثالوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے حواس سے ماوراء ہو کر ان کو توڑ کر نکل جائے۔ اس حوالے سے انسان کی روح تمام قسم کی نمائندگیوں کے ماتحت ہوگی

حالانکہ اس کا کوئی مادی جسم نہیں ہوتا نہ ہی یہ کوئی مادی وجود رکھتی ہے اور اس کا کوئی مادی وزن نہیں ہوتا۔ انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کا احساس کر سکے کیونکہ وہ ان سہ جہتی خیالی تصاویر کو حقیقی سمجھتا ہے اور ان کے وجود کا پورا پورا یقین رکھتا ہے اس لئے کہ ایک شخص ان ادراکات پر انحصار کرتا ہے جو اس کے حسی اعضاء کے ذریعے سے محسوس کرائے جاتے ہیں۔ ایک مشہور برطانوی فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اس حقیقت پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

میں یہ بات پوری صاف گوئی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میں جب اپنے آپ کو اس میں شامل کرتا ہوں جسے "میں خود" کہتا ہوں تو میں ہمیشہ ایک خاص ادراک کا سامنا کرتا ہوں جس کا تعلق گرم و سرد، روشنی یا سایے، محبت یا نفرت، کھٹے یا میٹھے یا کسی دوسرے خیال سے ہوتا ہے۔ ایک ادراک کی موجودگی کے بغیر میں ایک خاص وقت میں کبھی بھی اپنے آپ کو تسخیر نہیں کر سکتا اور مجھے سوائے ادراک کے کوئی اور شے نظر نہیں آتی۔

ادراکات کا دماغ میں متشکل ہونا کوئی فلسفہ نہیں بلکہ سائنسی حقیقت ہے

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ ہم جو کچھ یہاں کہہ رہے ہیں وہ ایک فلسفیانہ تصور ہے۔ تاہم جسے ہم "خارجی دنیا" کہتے ہیں یہ ادراکات کا مجموعہ ہے اور یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ سیدھی سادہ سی سائنسی حقیقت ہے۔ دماغ میں خیالی شبیہات اور احساسات کیسے متشکل ہوتے ہیں اس بارے میں تمام طبی کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ان حقائق کو بیسویں صدی کی سائنس ثابت کر چکی ہے، بالخصوص طبیعات یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ مادہ ایک مطلق حقیقت نہیں رکھتا اور ہر انسان ایک طرح سے "اپنے دماغ میں لگے ہوئے نگراں (مانیٹر) کو دیکھ رہا ہے"۔

ہر وہ انسان جو سائنسی حقائق پر یقین رکھتا ہے خواہ وہ ملحد ہو، بدھسٹ یا کسی دوسرے عقیدے کا ماننے والا، اسے اس حقیقت کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ ایک مادہ پرست بھی خالق کے وجود سے انکار کر سکتا ہے مگر وہ بھی اس سائنسی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔

کارل مارکس، فریڈرک انجلز، پولائزر اور دوسرے اس سادہ اور عیاں حقیقت کو نہ سمجھ سکے، یہ بات آج بھی بڑی حیران کن ہے حالانکہ ان کے زمانے میں سائنسی علوم اور دریافتیں ناکافی تھیں۔ ہمارے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور حالیہ دریافتوں اور

تحقیق نے اس حقیقت کو سمجھنا آسان بنا دیا ہے۔ دوسری طرف مادہ پرستوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ وہ بھی اس حقیقت کو سمجھے بغیر نہ رہ سکیں گے خواہ ایسا جزوی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ یہ حقیقت ان کے فلسفے کو باطل قرار دے رہی ہے۔

مادہ پرستوں کا عظیم خوف

تھوڑی مدت کے لئے ترک مادہ پرست حلقوں کی طرف سے اس کتاب میں دیئے گئے موضوع کے خلاف کوئی شدید ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا کہ مادہ محض ایک ادراک ہے۔ اس سے ہم یہ سمجھے کہ ہمارا نقطہ نظر زیادہ واضح نہیں تھا اور اس کی مزید وضاحت اور تشریح ضروری تھی۔ تاہم زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ بات سامنے آ گئی کہ مادہ پرست بڑے بے چین اور مضطرب ہیں کہ یہ موضوع اس قدر مقبول کیوں ہو رہا ہے اور مزید یہ کہ انہیں اس سے بڑا خوف محسوس ہوا۔

کچھ دیر تک تو مادہ پرستوں نے اپنے خوف و ہراس کا اظہار اپنی مطبوعات، کانفرنسوں اور اپنے ہم خیال لوگوں میں بڑھ چڑھ کر کیا تھا۔ ان کے اس احتجاج اور مایوسانہ طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک شدید دانشورانہ بحران کا شکار ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کی سائنسی موت، جو ان کے فلسفے کی بنیاد تھا، بھی ان کے لئے ایک بڑے صدمے سے کم نہ تھی۔ انہیں اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ خود مادے کو انہوں نے کھونا شروع کر دیا ہے جو ڈارونیت کی نسبت ان کے لئے زیادہ بڑا اسہارا ہے اور اس سے انہیں مزید بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ ان کے لئے ایک ''سب سے بڑا خطرہ'' تھا جو ''ان کے تہذیبی تانے بانے کو منسوخ'' کر دیتا ہے۔ مادہ پرست حلقوں میں سے ایک نہایت بے باک شخص Renan Pekunlu نے جو ایک مشہور علمی ادارے سے وابستہ تھا اور ''سائنس اینڈ یوٹوپیا'' (Bilim ve Utopya) نامی جریدے میں لکھتا بھی تھا، مادہ پرستی کے دفاع کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اپنے مقالات میں جو اس جریدے میں چھپے اور ان سیمیناروں میں جن میں اس نے شرکت کی، اس نے ''ارتقاء ایک فریب'' (Evolution Deceit) کو مادہ پرستی کیلئے ''اوّلین خطرہ'' قرار دیا۔

جس بات نے کتاب کے ان ابواب سے بھی زیادہ، جو ڈارونیت کو باطل ٹھہراتے ہیں، Pekunlu کو زیادہ پریشان کیا، وہ کتاب کا وہ حصہ ہے جسے اب آپ پڑھ رہے ہیں۔ اس نے اپنے قارئین (صرف مٹھی بھر) اور سامعین کو یہ پیغام دیا:

''مثالیت کے تلقین عقیدہ سے مرعوب نہ ہوں اور مادہ پرستی میں اپنے عقیدے کو مضبوط رکھیں''۔ اس نے ان کے سامنے روس کے خونی انقلاب کے رہنما Vladimir.I. Lenin کو حوالے کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس نے ہر ایک سے کہا کہ وہ لینن کی سو سالہ پرانی کتاب Materialism & Empirio-Criticism کا مطالعہ کرے۔ وہ لینن کے مشورے دہراتا رہا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا ''اس مسئلے پر مت سوچو ورنہ تم لوگ مادہ پرستی کے راستے سے ہٹ جاؤ گے اور مذہب تم لوگوں کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا''۔ مذکورہ بالا جرائد میں سے ایک میں لکھتے وقت اس نے لینن کی درج ذیل سطور کا اقتباس شامل کیا ہے:

ایک بار جب تم لوگ معروضی حقیقت کا انکار کر دیتے ہو، جو ہمیں حواس میں دی جاتی ہے تو آپ ''نظریۂ تیقن'' (Fideism)۔ کے خلاف استعمال ہونے والا ہر ہتھیار ضائع کر چکے ہوتے ہیں۔ جس لمحے ان لوگوں نے ''حواس'' (Sensations) کو خارجی دنیا کی ایک خیالی تصویر نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ اسے ایک خاص ''عنصر'' سمجھتے تھے، وہ اس کے دام فریب میں آچکے تھے۔

یہ کسی شخص کی حس، دماغ، روح، مرضی و ارادہ نہیں ہے۔ ان الفاظ سے یہ بات صاف صاف واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت جس کا لینن کو خوفناک حد تک اندازہ ہو گیا تھا اور جسے وہ اپنے ذہن سے اور اپنے ساتھیوں (کامریڈوں) کے ذہنوں سے نکال دینا چاہتا تھا، یہ بات بھی ہمعصر مادہ پرستوں کو یکساں طور پر پریشان کرنے کے لئے کافی تھی۔ تاہم Pekunlu اور دوسرے مادہ پرستوں کو زیادہ پریشانی لاحق ہے؛ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ سو سال قبل کی نسبت آج اس حقیقت کو زیادہ صاف صاف، واضح، یقینی اور ذہنوں میں اتر جانے والے انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اس موضوع کو اس غیر مزاحمتی طریقے سے پوری وضاحت کے ساتھ سامنے لایا جارہا ہے۔

تاہم عمومی صورت یہ بنتی ہے کہ مادہ پرست سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد اس حقیقت کہ ''مادہ ایک فریب یا سراب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے'' کے خلاف بڑا بھونڈا جواز پیش کرتی ہے۔ اس باب میں جس موضوع پر بات کی گئی ہے وہ ایک نہایت اہم اور جذبات انگیز موضوع ہے، شاید ہی ایسا کوئی اور موضوع ہوگا جس سے ایک انسان کا زندگی بھر آمنا سامنا ہو سکتا ہو۔ انہیں اس سے قبل ایسے اہم موضوع سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ پھر بھی ان سائنسدانوں کے ردعمل یا جس طرح وہ اپنی تقریروں اور مقالات میں اس کا اظہار کرتے ہیں یہ حال ہے کہ ان کا نقطہ نظر نہایت سطحی اور ان کی

سوچ اور فکر کی گہرائی کم دکھائی دیتی ہے۔

یہاں تک کہ جس موضوع پر یہاں بحث کی گئی ہے اس سے متعلق کچھ مادہ پرستوں کے ردعمل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مادہ پرستی پر ان کے اندھے یقین نے ان کے استدلال کو نقصان پہنچایا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس موضوع کو سمجھنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر Alaattin Senel جو ایک علمی ادارے سے وابستہ تھا اور Bilim Ve Utopia جریدے کے لئے لکھتا تھا، نے اسی طرح کے پیغامات دیئے جیسے Rennan Pekunlu نے دیئے تھے۔ اس نے کہا: ''ڈارونیت کی موت کو بھول جاؤ، اصل خطرہ تو اس موضوع سے ہے''۔ اور اس نے اس طرح کے مطالبے کئے: ''پس جو تم کہتے ہو اسے ثابت کرو'' وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے اپنے فلسفے کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ادیب نے خود کچھ سطریں ایسی لکھی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح بھی اس حقیقت کو گرفت میں نہیں لے سکتا جسے وہ ایک خطرہ سمجھتا ہے۔

مثال کے طور پر اس نے اپنے ایک مقالے میں جس میں صرف وہ اس موضوع پر بحث کر رہا تھا، Senel اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ خارجی دنیا کا ادراک دماغ میں ایک خیالی تصویر کے طور پر ہوتا ہے۔ پھر آگے چل کر وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خیالی تصویریں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں ایک وہ جو طبعی رابطے رکھتی ہیں اور دوسری وہ جو طبعی رابطے نہیں رکھتیں اور یہ کہ خارجی دنیا سے تعلق رکھنے والی خیالی تصویروں کے طبعی رابطے ہوتے ہیں۔ اپنے دعوے کی حمایت میں وہ ''ٹیلیفون کی مثال'' پیش کرتا ہے۔ خلاصے کے طور پر اس نے لکھا کہ ''میں نہیں جانتا کہ میرے دماغ میں تشکیل پانے والی خیالی تصویروں کا خارجی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق و رشتہ ہے یا نہیں مگر جب میں فون پر بات کرتا ہوں تو اسی چیز کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب فون پر کسی سے بات کرتا ہوں تو جس شخص سے میں بات کر رہا ہوتا ہوں وہ مجھے نظر نہیں آتا مگر جب بعد ازاں میں اس شخص سے بالمشافہ ملتا ہوں تو میں اپنی گفتگو کے بارے میں تصدیق کر سکتا ہوں۔

یہ کہتے وقت دراصل اس ادیب کا مطلب یہ تھا: ''اگر ہم اپنے ادراکات پر شبہ کرنے لگ جائیں تو ہم نہ تو اس مادے کو دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی حقیقت کی پڑتال کر سکتے ہیں''۔ تاہم یہ ایک عیاں غلط فہمی ہے اس لئے کہ ہمارے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس مادے تک پہنچ سکیں۔ ہم اپنے ذہن سے باہر کبھی نکل ہی نہیں سکتے اور نہ ہی یہ جان سکتے ہیں کہ ''باہر'' کیا ہے۔ خواہ فون پر ہونے

والی بات کا کوئی رشتہ وتعلق ہے یا نہیں، اس کی تصدیق اس شخص سے کی جا سکتی ہے جس کے ساتھ فون پر گفتگو ہوئی۔ تاہم یہ تصدیق بھی دماغ کا ایک خیالی تجربہ ہوگا۔

دراصل یہ لوگ ان ہی واقعات کو اپنے خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ فون پر بات کر رہا ہے اور پھر وہ اس بات چیت کے بارے میں اس شخص سے تصدیق کر لیتا ہے جس سے اس نے بات کی تھی۔ یا Pekunlu اپنے خواب میں یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اسے "ایک سنگین خطرہ" لاحق ہے اور وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ سو سال قبل لکھی گئی لینن کی کتاب پڑھیں۔ تاہم یہ بات قابل غور نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ یہ مادہ پرست اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ جن واقعات کے تجربے سے وہ گزرے ہیں اور جن لوگوں سے وہ اپنے خوابوں میں ہمکلام ہوئے ہیں وہ سوائے ادراکات کے کچھ نہ تھا۔

مگر ایک شخص کس سے اس بات کی تصدیق کرے گا کہ دماغ کے اندر تشکیل پانے والی یہ خیالی شبیہات رابطہ وتعلق رکھتی ہیں یا نہیں؟ کیا اسے دوبارہ اپنے دماغ میں موجود ان خیالی پیکروں سے رجوع کرنا ہوگا؟ بلاشبہ مادہ پرستوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس معلومات کے ماخذ کو تلاش کر سکیں جو دماغ سے باہر کی دنیا کے بارے میں اعداد وشمار دے سکے اور اس کی تصدیق کر سکے۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ تمام ادراکات دماغ میں متشکل ہوتے ہیں مگر یہ فرض کرتے ہوئے کہ کوئی انسان اس سے "باہر" قدم رکھ سکتا ہے وہ حقیقی خارجی دنیا کے ذریعے ان ادراکات کی تصدیق کر لینے کے بعد یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس شخص کی قوت مدرکہ بہت محدود ہے اور اس کا استدلال بڑا مسخ شدہ ہے۔

تاہم جس حقیقت کے بارے میں یہاں بتایا جا رہا ہے ایک عام فہم واستدلال کا مالک شخص بھی اسے آسانی کے ساتھ تسخیر کر سکتا ہے۔ تعصبات سے بالاتر ہو کر ہر شخص، جو کچھ ہم نے کہا اس سے متعلق جان جائے گا، کہ حواس کی مدد سے وہ خارجی دنیا کی موجودگی کی پڑتال نہ کر سکے گا۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ مادہ پرستی پر اندھا یقین لوگوں کی استدلالی صلاحیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے معاصر مادہ پرست اپنے ان نگرانوں (Mentors) کی طرح بہت سے منطقی نقائص کو منظر عام پر لے آتے ہیں، جنھوں نے مادے کی موجودگی کو "ثابت" کرنے کے لئے پتھروں کو ٹھوکر ماری اور کیک کھائے تھے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی حیرانگیز صورت حال نہیں ہے؛ کیونکہ نہ سمجھنے والی صفت تمام کافروں میں مشترک ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ان کے بارے میں اللہ جل شانہٗ بطور خاص فرماتا ہے: ''یہ لوگ عقل نہیں رکھتے''۔ (سورۃ المائدہ: ۵۸)

مادہ پرست تاریخ کے سب سے بڑے دام میں پھنس چکے ہیں

ترکی میں مادہ پرست حلقوں نے جو وسیع پیمانے پر دہشت کی فضا پیدا کی ہے جس میں سے ہم نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں، اس سے بھی یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مادہ پرستوں کو جس شکست فاش کا یہاں سامنا کرنا پڑا اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ جدید سائنس نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ مادہ محض ایک ادراک ہے اور اسے ایک صاف صاف، واضح اور دو ٹوک انداز میں بڑے زوردار طریقے سے سامنے لایا گیا ہے۔ اب یہ مادہ پرستوں پر منحصر ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ پوری مادی دنیا جس پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین رکھتے اور اعتبار کیا کرتے تھے کس طرح گر کر ڈھیر ہوگئی ہے۔

انسانیت کی پوری تاریخ میں مادہ پرستانہ فکر ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اپنے آپ پر اور اپنے فلسفے پر یقین رکھتے ہوئے انہوں نے اللہ کے خلاف بغاوت کر دی جس نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ جو منظر نامہ انہوں نے تشکیل دیا اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مادے کی ابتداء اور انتہاء کوئی نہیں ہے۔ اور ان کا ممکنہ طور پر کوئی خالق نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے جب اللہ کا انکار کیا تو انہوں نے اس مادے میں پناہ لی جو ان کے خیال میں ایک حقیقی وجود رکھتا تھا۔ ان کا اس فلسفے پر اس قدر یقین تھا کہ ان کے خیال میں ایسا کبھی ممکن نہ ہوگا کہ اسے اس کے برعکس ثابت کرنے کے لئے کسی تشریح کی ضرورت ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ مادے کی اصل حقیقت کے بارے میں جن حقائق کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا اس نے ان لوگوں کو بہت حیران کر دیا تھا۔ جو کچھ یہاں بیان کیا ہے اس نے ان کے فلسفے کی بنیاد ہلا کر رکھ دی ہے اور مزید بحث کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ وہ مادہ جس پر ان کے تمام خیالات، زندگیوں، ہٹ دھرمی اور انکار کی بنیاد تھی اچانک غائب ہوگیا۔ جب مادے کا ہی کوئی وجود نہیں ہے تو مادہ پرستی کیسے موجود ہوگی؟

اللہ کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ منکرین حق کے خلاف بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں یوں آیا ہے:

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

''وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے'' (سورۃ الانفال: ۳۰)

اللہ نے مادہ پرستوں کو انہیں یہ سمجھنے کی طرف مائل کر کے گھیر لیا تھا کہ مادہ موجود ہے اور جب انہوں نے ایسا کیا تو انہیں ان دیکھے طریقے سے ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا تھا۔ مادہ پرست اپنے مال و اسباب، مرتبے، عہدے، طبقہ جس سے ان کا تعلق تھا، پوری دنیا اور جو کچھ اس میں تھا سب پر یقین رکھتے تھے۔ مگر ان سب پر انحصار کرتے ہوئے وہ اللہ کے باغی ہو گئے تھے۔ انہیں اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ تھا اور وہ اللہ کے خلاف بغاوت پر اتر آئے تھے۔ ایسا کرتے وقت وہ مکمل طور پر مادے پر انحصار کر رہے تھے۔ مگر ان میں علم و فراست کی اس قدر کمی ہے کہ وہ یہ سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں کہ اللہ ان پر چاروں طرف سے محیط ہے۔ منکرین حق جس حالت میں ہیں اور اپنی حماقت اور کوڑھ مغزی کے نتیجے میں کہاں جا رہے ہیں اس کا اعلان اللہ یوں فرماتا ہے:

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝

''کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو کفر کرنے والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی''۔ (سورۃ الطور: ۴۲)

یہ یقیناً تاریخ میں سب سے بڑی شکست ہے۔ مادہ پرستوں نے جب اللہ کے خلاف جنگ چھیڑ دی تو انہیں اس میں بری طرح شکست ہوئی۔ اس بارے میں قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں دراصل وہ اپنے مکر و فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے''۔ (سورۃ الانعام: ۱۲۳)

ایک اور سورۃ میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں مگر دراصل وہ خود اپنے

آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں۔ اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے''۔ (سورۃ البقرۃ:۹)

جب یہ منکرین حق کوئی چال چلتے ہیں تو ایک نہایت اہم حقیقت بھول جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں جس کا انہیں شعور نہیں رہتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر وہ شے جو ان کے تجربے میں آتی ہے وہ ایک خیالی پیکر ہے، جس کا وہ ادراک کرتے ہیں اور ان کی تمام چالیں جو وہ تشکیل دیتے ہیں ان کے ہر دوسرے کام کی طرح ان کے اپنے ذہنوں میں متشکل ہونے والی خیالی تصویریں ہوتی ہیں۔ وہ احمق ہیں جو یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ بالکل اکیلے ہیں اور اسی لئے وہ اپنی ہی پرفریب چالوں میں پھنس جاتے ہیں۔

ماضی کے منکرین حق کی مانند آج کے کافروں کو بھی اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کی پرفریب چالوں کو ان کی بنیاد سمیت ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اللہ نے ارشاد فرمادیا ہے کہ کفار کی یہ چالیں جس روز تیار کی گئیں اسی روز انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور مومنین کو یہ خوشخبری سنادی گئی:

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ط

''مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی''۔ (سورۃ آل عمران:۱۲۰)

ایک اور سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ط حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا ط

''(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا''۔ (سورۃ النور:۳۹)

مادہ پرستی بھی باغیوں کے لئے ایک ''سراب'' بن جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے اوپر دی گئی آیت میں کہ جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سراب تھا۔ اللہ نے اس قسم کے سراب سے انہیں خود چال چل کے دکھائی اور ان کو اس طرح دھوکے میں ڈال دیا کہ وہ خیالی شبیہات کے مجموعے کو اصلی سمجھنے لگ گئے تھے۔ وہ تمام ''مشہور'' لوگ، پروفیسر، ماہرین علم فلکیات، ماہرین حیاتیات، طبیعات دان اور تمام دوسرے بلا امتیاز عہدہ ومنصب بچوں کی مانند فریب میں آجاتے ہیں اور اس لئے ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں کیونکہ مادے کو اپنا خدا سمجھتے تھے۔ انہوں نے خیالی تصاویر کے مجموعے کو اصلی سمجھا اور اپنے فلسفے کی بنیاد اس نظریے پر رکھ دی تھی۔ وہ بڑی سنجیدہ بحث

کرتے تھے اور انہوں نے اسے ایک نام نہاد "دانشورانہ" نام دے دیا تھا۔ وہ اس کائنات کی سچائی کے بارے میں دلائل دیتے وقت اپنے آپ کو بڑا دانا سمجھتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی محدود سی عقل سے اللہ کے متعلق مناظرے کرتے تھے۔ اللہ نے ان کی حالت کا ذکر درج ذیل سورۃ میں یوں فرمایا ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝

"وہ خفیہ تدبیریں کرنے لگے تھے جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے"۔ (سورۃ آل عمران: ۵۴)

ممکن ہے کچھ تدبیروں سے بچا جاسکتا ہو مگر اللہ کی اس تدبیر سے بچنا ناممکن تھا جو کفار کے خلاف تھی۔ وہ خواہ کچھ بھی کرلیں اور جس سے چاہیں درخواست کر دیکھیں اللہ کے سوا انہیں کوئی مددگار بھی نہ مل سکے گا۔ اس نے اس بارے میں قرآن پاک میں اس طرح مطلع فرمایا ہے:

وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۝

"اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی ومدد پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے"۔ (سورۃ النساء: ۱۷۳)

مادہ پرستوں نے یہ کبھی توقع نہ کی تھی کہ اس قسم کے جال میں پھنس جائیں گے۔ بیسویں صدی کے تمام وسائل رکھتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اپنے انکار میں ضدی اور ہٹ دھرم ہو سکتے ہیں اور لوگوں کو مذہب سے دور کھینچ لے جاسکتے ہیں۔ منکرین حق کی یہ کبھی نہ بدلنے والی ذہنیت اور ان کے انجام کے بارے میں قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں یوں ارشاد ہوا ہے:

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ۝

"یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو"۔ (سورۃ النمل: ۵۱-۵۰)

اس کا ایک مفہوم ان آیات میں بیان کردہ حقیقت کے مطابق یہ بنتا ہے: مادہ پرستوں کو احساس دلایا جارہا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ ایک سراب ہے اور اسی لئے جو کچھ ان کے پاس ہے اسے ضائع کردیا گیا ہے۔ یہ اپنے مال واسباب، کارخانوں، سونے، ڈالروں، بچوں، بیویوں، دوستوں، عہدہ ومنصب یہاں تک کہ اپنے جسموں پر نظر ڈالتے ہیں، جو ان کے خیال میں

موجود ہیں مگر ان کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سورۃ الانعام کی آیت:۵۱ کے مطابق ''ضائع'' کر دیا گیا ہے۔اس مقام پر وہ مادے نہیں رہے بلکہ روحیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سچائی مادہ پرستوں کے لئے بدترین شے ہے۔ یہ حقیقت کہ جو کچھ ان کے پاس ہے ایک سراب ہے اس کا مطلب ان کے اپنے الفاظ میں اس دنیا میں ''مرنے سے پہلے موت'' ہے۔

یہ حقیقت ان کو اللہ کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیتی ہے، اس قرآنی آیت کے مطابق اللہ نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ ہر انسان دراصل اللہ کی موجودگی میں تنہا ہوتا ہے:

ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ۙ

''چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلے پیدا کیا''۔(سورۃ المدثر:۱۱)

اس اہم حقیقت کو قرآن پاک کی اور بھی کئی سورتوں میں دہرایا گیا ہے:

وَلَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّتَرَکۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰکُمۡ وَرَآءَ ظُھُوۡرِکُمۡ ۚ

''(اور اللہ فرمائے گا) لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو''۔ (سورۃ الانعام:۹۴)

وَ کُلُّھُمۡ اٰتِیۡہِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًا ۙ

''سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے''۔(سورۃ مریم:۹۵)

قرآنی آیات میں جس حقیقت کا ذکر کیا گیا، اس کا ایک مفہوم یہ بنتا ہے:

وہ جو مادے کو اپنا خدا مانتے ہیں انہیں اللہ نے تخلیق کیا ہے اور اسی کے پاس انہیں لوٹ کر جانا ہے۔ وہ ایسا چاہیں نہ چاہیں مگر ان کی مرضی ومنشا اللہ کی مرضی کے تابع ہے۔ اب وہ یوم حساب کا انتظار کریں جس دن کہ ان میں سے ہر ایک سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اسے سمجھنے کے لئے جس قدر چاہیں بددلی کا اظہار کریں۔

خلاصہ

اب تک جس موضوع پر ہم نے بات کی وہ ایک سب سے بڑی سچائی ہے جو آپ کو پوری

زندگی میں کبھی نہ بتائی گئی ہوگی۔ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ تمام مادی دنیا دراصل ایک ''پرچھائیں'' ہے، یہ موضوع اللہ کے وجود اور اس کے خالق ہونے کے بارے میں اور یہ جاننے کیلئے کہ وہی ذاتِ بے مثل و بے مثال قادر مطلق ہے، ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ شخص جو اس موضوع کو سمجھتا ہے، اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا وہ کچھ نہیں جو زیادہ تر لوگوں کی نظر میں ہے۔ یہ دنیا ایک ایسا مطلق مقام نہیں جہاں ایک اصلی وجود پایا جاتا ہو، جیسا کہ وہ لوگ سمجھتے ہیں جو بے مقصد گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے ہیں، جو شراب خانوں میں ایک دوسرے سے الجھتے ہیں، جو مہنگے ریستورانوں میں اپنی دولت کا مظاہرہ کرتے ہوں جو اپنی املاک پر شیخی بگھارتے پھرتے ہیں یا جنہوں نے کھوکھلے اور بیکار مقاصد کے لئے اپنی عمریں وقف کر رکھی ہیں۔ یہ دنیا ادراک کا مجموعہ اور ایک سراب ہے وہ تمام لوگ جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا سایے ہیں جو ان ادراکات کو اپنے ذہنوں میں دیکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔

یہ نظریہ اس لئے اہم ہے کیونکہ یہ اس مادہ پرستانہ فلسفے کی قدر و قیمت گھٹا دیتا ہے جو اللہ کے وجود سے انکار کرتا اور اس کی موت کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس، اینجلز اور لینن جیسے اشتراکیوں نے خوف محسوس کیا۔ غضبناک ہوئے اور اپنے پیروکاروں کو انتباہ کیا کہ جب کبھی ان کو اس کے بارے میں بتایا جائے تو اس نظریے پر کبھی ''مت سوچیں''۔ دراصل ان لوگوں کی ذہنی حالت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ادراکات دماغ کے اندر متشکل ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ دنیا جو انہیں دماغ کے اندر نظر آتی ہے وہ ''خارجی دنیا'' ہے۔ اور اس کے برعکس عیاں اور واضح ثبوت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

یہ بے خبری اس عقل و دانائی کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے جو اللہ نے منکرین حق کو دے رکھی ہوتی ہے۔ ان کفار کے بارے میں قرآن پاک میں یوں ارشاد ہوا:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○

''ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں''۔ (سورۃ الاعراف:۱۷۹)

آپ اپنی ذاتی فکر کی قوت سے اس مقام سے آگے تک دریافت کر سکتے ہیں اس کے لئے

آپ کو پورے انہماک کے ساتھ اپنے اردگرد کی چیزوں پر غور وفکر کرنا ہوگا اور ان چیزوں کو اس طرح قبول کرنا ہوگا جیسی وہ نظر آتی ہیں اور جس طرح آپ ان کا لمس محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ نے بہ نظرِ عمیق غور وفکر کیا تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک دانا و بینا انسان جو دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سوچتا ہے اور اس لمحے اس کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے وہ ایک روح ہے جو ان ادراکات کو پردۂ سکرین پر دیکھ رہی ہے جسے ''مادہ'' کہتے ہیں۔ جو انسان اس کو سمجھتا ہے اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مادی دنیا کی سرحدوں سے دور نکل گیا ہے جو بنی نوع انسان کی اکثریت کو دھوکہ دیتی ہے اور وہ حقیقی وجود کی اقلیم میں داخل ہو چکا ہے۔

اس حقیقت کو تاریخ میں بہت سے ملحدین اور فلسفیوں نے سمجھ لیا ہے۔ مسلم دانشور مثلاً امام ربانی، محی الدین ابن عربی اور مولانا جامی کو اس حقیقت کا احساس قرآنی آیات کے ذریعے سے ہوا۔ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ اپنا استدلال بھی استعمال کیا۔ کچھ مغربی فلسفیوں مثلاً جارج برکلے وغیرہ نے اس حقیقت کو بذریعہ استدلال سمجھا ہے۔ امام ربانی اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ یہ پوری مادی دنیا ایک ''سراب اور قیاس'' ہے۔ اور ذات مطلق صرف اللہ ہے:

اللہ...... اس نے جو چیزیں تخلیق کیں ان کا وجود حقیقی عدم ہے۔ اس نے سب کچھ حواس اور سرابوں کے حلقے کے اندر تخلیق کیا ہے...... اس کائنات کا وجود ان حواس اور سرابوں پر قائم ہے اور یہ مادی نہیں ہے...... دراصل خارجی دنیا میں سوائے اس جلیل القدر ہستی کے (جو اللہ ہے) کچھ بھی نہیں ہے۔

امام ربانی نے نہایت صاف صاف طور پر فرمایا کہ وہ تمام خیالی پیکر جو انسان کو پیش کیے گئے سراب ہیں اور ''خارجی دنیا'' میں ان کی اصل تصویریں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔

اس تصوراتی دائرہ کی تصویر کشی تخیل میں کی گئی ہے۔ یہ اسی حد تک دیکھا جا سکتا ہے جس حد تک اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مگر اسے دیکھا صرف ذہن کی آنکھ سے جا سکتا ہے۔ خارجی دنیا میں ایسا لگتا ہے جیسے اسے سر کی آنکھ سے دیکھا جا رہا ہے۔ تاہم ایسی بات نہیں ہے۔ خارجی دنیا میں نہ اس کا کوئی نمایاں لقب ہے نہ کوئی نشان، کوئی ایسی حالت نہیں ہوتی جسے دیکھا جا سکے۔ ایک آئینے میں منعکس کسی انسان کا چہرہ ایسا ہوتا ہے۔ خارجی دنیا میں اسے کوئی ثبات یا ٹھہراؤ حاصل نہیں ہے۔ بیشک اس کا ٹھہراؤ اور تصویر دونوں تخیل میں ہوتے ہیں۔ اللہ وہ ہے جو بہتر جانتا ہے۔

مولانا جامی نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے جو آپ نے قرآنی آیات کی پیروی کر کے اور

اپنی عقل استعمال کرنے کے بعد دریافت کی: ''کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ حواس اور سراب ہے۔ وہ یا تو آئینہ میں منعکس ہونے والے پرتو ہیں یا سایے''۔

تاہم جن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا تاریخ میں ان کی تعداد ہمیشہ بہت محدود رہی ہے۔ بڑے بڑے سکالر مثلاً امام ربانی نے لکھا ہے کہ اس حقیقت کو عوام کو بتانا بہت تکلیف دہ بات رہی ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جس عہد میں ہم رہ رہے ہیں اس میں سائنس نے اس حقیقت کو ثبوت مہیا کر کے اسے تجرباتی بنا دیا ہے۔ یہ حقیقت کہ دنیا ایک سایہ ہے اسے تاریخ میں پہلی بار نہایت ٹھوس، واضح اور صاف صاف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس وجہ سے اکیسویں صدی ایک ایسا تاریخی موڑ ہوگا جب لوگ الہامی حقیقتوں کو سمجھنے لگیں گے اور اللہ کی جانب گروہ در گروہ رخ کریں گے، جو واحد ذات مطلق ہے۔ اکیسویں صدی میں انیسویں صدی کے مادہ پرستانہ عقائد کو نکال کر تاریخ کے لغو لٹریچر کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے گا۔ اللہ کی موجودگی اور تخلیق کی بات سمجھ میں آجائے گی، لامکانیت اور لازمانیت کے حقائق سمجھ میں آجائیں گے۔ نوع انسانی صدیوں پرانے پردوں، دھوکہ وفریب اور توہم پرستی کو توڑ کر باہر نکل آئے گی جو انہیں اب تک جکڑے ہوئے تھی۔

اس ناگزیر راستے کے لئے کوئی بھی سایہ سدِ راہ نہیں بن سکے گا۔

اضافیتِ زماں اور مسئلہ تقدیر کی حقیقت

جو کچھ اب تک بیان کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ''سہ جہتی مکاں'' درحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اور یہ کہ یہ ایک ایسی بدگمانی ہے جو مکمل طور پر قیاسات کی پیداوار ہے اور یہ کہ انسان پوری عمر ''لامکانیت'' میں گزارتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ کہنے کے لئے ایک تو ہم پرستانہ عقیدہ اختیار کرنا پڑے گا جو استدلال اور سائنسی سچائی سے دور ہوگا، اس لئے کہ سہ جہتی مادی دنیا کی موجودگی کا کوئی معقول ثبوت نہیں ہے۔

یہ حقیقت اس ابتدائی مادہ پرستانہ فلسفے کے مفروضے کی تردید کر دیتی ہے جو نظریۂ ارتقاء کو سہارا دیتا ہے۔ اس مفروضے کے مطابق مادہ مطلق اور دائمی ہے۔ دوسرا مفروضہ جس کے سہارے مادہ پرستانہ فلسفہ کھڑا ہے، وہ یہ ہے کہ زماں مطلق اور دائمی ہے۔ یہ بھی اسی قدر توہم پرستانہ ہے جس قدر پہلا مفروضہ۔

زماں کا ادراک

وہ ادراک جسے ہم زماں کہتے ہیں وہ دراصل ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے ایک لمحے کا موازنہ دوسرے لمحے سے کیا جاتا ہے۔ ہم اس کی تشریح ایک مثال کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ جب ایک شخص کسی شے کو ہاتھ سے تھپتھپاتا ہے تو اسے ایک خاص آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ شخص اسی شے کو پانچ منٹ بعد تھپتھپائے گا تو ایک اور طرح کی آواز آئے گی۔

وہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ پہلی آواز اور دوسری آواز کے درمیان ایک وقفہ ہے اور وہ اس وقفے کو ''زماں'' کا نام دیتا ہے۔ مگر جس وقت وہ دوسری آواز سنتا ہے تو پہلی آواز اس کے ذہن میں ایک

تصور کے طور پر موجود تھی۔ یہ اس کے حافظے میں ایک معلومات کا چھوٹا سا حصہ تھا۔ وہ شخص جس لمحے میں زندہ ہوتا ہے وہ اسے اپنے حافظے میں محفوظ یاد کے ساتھ موازنہ کر کے "زماں" کے ادراک کو تشکیل دیتا ہے۔ اگر وہ یہ موازنہ نہیں کرتا تو زماں کا ادراک نہیں ہوگا۔

اسی طرح ایک شخص اس وقت موازنہ کرتا ہے جب وہ کسی کو کمرے میں دروازے سے داخل ہوتے اور کمرے کے وسط میں کرسی پر بیٹھتے دیکھتا ہے۔ جس وقت یہ آدمی کرسی پر بیٹھتا ہے، جب وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتا ہے اور کرسی تک چل کر جاتا ہے، تو ان لمحات سے متعلق خیالی تصویریں معلومات کے ایک حصے کے طور پر اس کے دماغ میں یکجا ہو جاتی ہیں۔ زماں کا ادراک اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہ شخص کرسی پر بیٹھے ہوئے اس آدمی کا موازنہ اس معلومات کے چھوٹے سے حصے کے ساتھ کرتا ہے جو اس کے پاس ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زماں اس موازنے کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے جو دماغ میں ذخیرہ شدہ کچھ سرابوں کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اگر انسان کے پاس یادداشت نہ ہوتی تو پھر اس کے دماغ نے اس قسم کی تصریحات نہ کی ہوتیں اور یوں زماں کا ادراک کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ ایک انسان یہ کیوں فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ تیس سال کا ہو گیا ہے، اس لئے کہ ان تیس برسوں سے متعلق معلومات اس کے ذہن میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس کا حافظہ کام نہ کرتا تو وہ گزرے ہوئے اس وقت کی موجودگی کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچتا اور وہ صرف اس ایک "لمحے" کے تجربے سے گزر رہا ہوتا جس میں وہ زندگی گزار رہا تھا۔

لازمانیت کی سائنسی توجیہہ

آیئے ہم اس موضوع کی وضاحت کے لئے مختلف سائنسدانوں اور سکالروں کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ زماں کے موضوع پر اس حوالے سے کہ وہ پیچھے کی جانب بہتا ہے مشہور دانشور اور نوبل انعام یافتہ پروفیسر، شعبہ جینیات Francois Jacob اپنی کتاب "Le jeu des Possibles" (The Possible & the Actual) میں لکھتا ہے:

فلمیں پیچھے کی جانب چلتی تھیں، جس سے ہمیں ایک ایسی دنیا کا تصور ملا جس میں وقت پیچھے کی جانب بہتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں دودھ اپنے آپ کو کافی سے جدا کر لیتا ہے اور پیالی میں سے اچھل کر دودھ دان میں پہنچ جاتا ہے: ایک ایسی دنیا جس میں روشنی کی لہریں روشنی کے ماخذ

میں سے اچھل کر نکلنے کے بجائے دیواروں سے پھوٹ کر ایک مرکز ثقل میں جمع ہو جاتی ہیں؛ ایک ایسی دنیا جس میں ایک پتھر لڑھک کر ایک انسان کی ہتھیلی پر آ جاتا ہے اور ایسا کرنے میں پانی کے لاتعداد قطرے پتھر کی مدد کرتے ہیں کہ وہ اچھل کر پانی سے باہر آ جائے۔ مگر ایک ایسی دنیا جس میں پانی کی اس قدر متضاد صفات ہوں ہمارے دماغ کا عمل اور ہماری یادداشت جس طرح معلومات کو یکجا کرتی ہے اسی طرح سے وہ پچھلی جانب اپنا کام جاری رکھیں گے۔ یہی بات ماضی اور مستقبل کے بارے میں سچ ہے اور دنیا ہمیں بالکل ویسی ہی دکھائی دے گی جیسی یہ اس وقت نظر آ رہی ہے۔

ہمارا دماغ چونکہ واقعات کی ایک خاص ترتیب کا عادی ہوتا ہے اس لئے دنیا اس طرح کام نہیں کرتی جس طرح اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وقت کا بہاؤ ہمیشہ آگے کی جانب ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو دماغ کے اندر تشکیل پاتا ہے اور اسی لئے یہ مکمل طور پر اضافی ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم یہ کبھی بھی نہیں جان سکتے کہ وقت کس طرح بہتا ہے یا یہ کہ وقت بہتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ وقت ایک مطلق حقیقت نہیں بلکہ ایک قسم کا ادراک ہے۔

اضافیت زماں ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق ۲۰ ویں صدی کے ایک بہت بڑے طبیعات دان البرٹ آئن سٹائن نے کی ہے۔ لنکن بارنٹ اپنی کتاب ''کائنات اور ڈاکٹر آئن سٹائن'' (The Universe & Dr. Einstein) میں لکھتا ہے:

مطلق مکاں کے ساتھ ساتھ آئن سٹائن نے مطلق زماں کے تصور کو بھی مسترد کیا تھا۔ اسے اس بات سے انکار تھا کہ کائنات کا غیر متغیر بے رحم وقت لامحدود ماضی سے بہہ کر لامحدود مستقبل کی طرف جا رہا ہے۔ زیادہ تر ابہام جو نظریہ اضافیت کو گھیرے ہوئے ہے انسان کی اس ہچکچاہٹ سے پیدا ہوتا ہے جو رنگ کے احساس کی طرح وقت کے احساس کو تسلیم کرنے سے متعلق ہوتی ہے، جو ادراک کی ایک شکل ہے۔ جس طرح مکاں (Space) مادی اشیاء کی ممکنہ ترتیب کا نام ہے اسی طرح زماں (Time) واقعات کی ممکنہ ترتیب کو کہا جاتا ہے۔ زماں کی موضوعیت کو آئن سٹائن کے اپنے الفاظ میں بہترین طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''ایک فرد کے تجربات واقعات کی ممکنہ ترتیب کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سلسلہ وار واقعات میں سے ہم ان واقعات کو یاد رکھتے ہیں جو ''پہلے'' اور ''بعد'' کی ترتیب کے لحاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک فرد کے لئے ایک ''میں زماں'' (I-Time) یا موضوعی زماں ہوتا ہے۔ یہ بذات خود قابل پیمائش نہیں ہے۔ میں

تعداد کو واقعات کے ساتھ وابستہ کر سکتا ہوں وہ اس طرح کہ بڑے ہندسے کو بعد کے واقعہ کے ساتھ بجائے شروع کے واقعہ کے منسوب کیا جائے۔

آئن سٹائن نے خود اس طرف اشارہ کیا، جیسا کہ Barnette کی کتاب کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے: ''مکان و زماں وجدان اور ادراک کی شکلیں ہیں جن کو اسی طرح شعور و آگاہی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جس طرح ہمارے رنگ، شکل یا جسامت کے ہمارے قیاسات و ادراک کو۔ نظریۂ عمومی اضافیت کے مطابق: ''واقعات کی ترتیب سے ہٹ کر زماں کا کوئی آزاد وجود نہیں ہے جس سے ہم اس کی پیمائش کرتے ہیں''۔

زماں چونکہ قیاسات اور ادراک پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے یہ مکمل طور پر مدرک (Perceiver) پر منحصر ہے اور اس لئے یہ اضافی ہے۔

وہ رفتار جس کے ساتھ وقت بہتا ہے وہ جن حوالوں کو ہم استعمال کرتے ہیں ان کے مطابق مختلف ہے اس لئے کہ انسانی جسم کے اندر کوئی ایسی قدرتی گھڑی نہیں ہے جو صحیح صحیح یہ بتا سکے کہ وقت کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے۔ جیسا کہ لنکن بارنٹ نے لکھا:

''جس طرح آنکھ کے بغیر رنگ کچھ بھی نہیں، جو اسے دیکھتی ہے، اسی طرح ایک لمحہ یا ایک گھنٹہ یا ایک روز اس وقت تک کچھ بھی نہیں جب تک ایک واقعہ ان کی نشاندہی کرنے کے لئے نہ ہو''۔

اضافیت زماں کا صحیح صحیح تجربہ خوابوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ خواب میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں لگتا ہے وہ کئی گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے لیکن دراصل یہ چند منٹوں کی بات ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ خواب چند سیکنڈوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

آیئے اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ایک مثال پر نظر دوڑاتے ہیں۔

ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے جس میں صرف ایک کھڑکی ہے، جسے ایک خاص ڈیزائن میں بنایا گیا ہے۔ ہمیں اس کمرے میں ایک خاص عرصے تک رہنا ہے۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کمرے میں ایک گھڑی بھی رکھ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم وقتاً فوقتاً کھڑکی میں سے طلوع و غروب آفتاب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چند روز بعد جب ہم سے یہ پوچھا گیا کہ ہم نے اس کمرے میں کتنا وقت گزارا تو ہم اپنا جواب گھڑی سے حاصل کردہ معلومات اور طلوع و غروب آفتاب کی گنتی کی مدد سے تیار کریں گے۔ مثال کے طور پر ہمارا

اندازہ یہ ہوگا کہ ہم نے اس کمرے میں تین روز گزارے ہیں۔ مگر وہ شخص جس نے ہمیں اس کمرے میں بند کیا تھا آ کر یہ بتاتا ہے کہ ہم وہاں صرف دو روز تک رہے اور جو سورج ہم کھڑکی سے طلوع وغروب ہوتے دیکھتے رہے وہ تو جھوٹ موٹ ایک مشین کے ذریعے نکلتا ڈوبتا دکھایا گیا تھا۔ اور کمرے میں رکھی ہوئی گھڑی کو تیز کر دیا گیا تھا یوں وقت کا جو حساب ہم نے لگایا وہ بے معنی ہو گیا تھا۔

اس مثال سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ وقت کے گزرنے کی شرح کا انحصار اضافی حوالوں پر تھا۔ اضافیت زماں ایک سائنسی حقیقت ہے جسے سائنسی اصولیات بھی ثابت کر چکا ہے۔ آئن سٹائن کا نظریۂ عمومی اضافیت بتاتا ہے کہ وقت کی رفتار کسی شے کی اپنی رفتار اور مرکز ثقل سے اس کے فاصلے کے مطابق بدل جاتی ہے۔ جوں جوں رفتار بڑھتی ہے وقت مختصر ہوتا جاتا ہے اور سمٹتا جاتا ہے۔ پھر وہ سست پڑ جاتا ہے جیسے ''تھم جانے'' پر آ گیا ہو۔

آیئے اس کی وضاحت آئن سٹائن ہی کی ایک مثال کے ذریعے کرتے ہیں۔ دو جڑواں بھائیوں کا تصور کیجیے جن میں سے ایک زمین پر رہتا ہے جبکہ دوسرا روشنی کی رفتار کے برابر رفتار کے ساتھ خلاء میں سفر کرتا ہے۔ وہ جب خلاء سے واپس زمین پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی (جو زمین پر تھا) اس سے زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص روشنی کی رفتار کے ساتھ خلاء میں سفر کرتا ہے وہاں وقت بہت سست رفتاری کے ساتھ گزرتا ہے۔ اگر یہی مثال ایک خلاء میں سفر کرنے والے باپ اور اس کے زمین پر رہنے والے بیٹے کے بارے میں دی جائے، تو باپ سفر پر جاتے وقت اگر ۲۷ برس کا تھا اور بیٹا ۳ سال کا تو باپ جب واپس زمین پر آتا ہے تو ۳۰ سال بعد (زمینی وقت کے مطابق) بیٹا ۳۳ برس کا ہوگا مگر باپ صرف تین برس کا۔

ہم اس بات کو واضح کر دیں کہ یہ اضافیت زماں گھڑی کی رفتار کی تیزی یا سستی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی نہ ہی یہ کسی مکینیکل سپرنگ کے کم رفتار کے ساتھ چلنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ بلکہ یہ تو پورے مادی نظام کی کارکردگی کے مختلف دورانیے کے نتیجے میں ہوا ہے جو اس قدر گہرائی تک چلا جاتا ہے جس قدر ذیلی جوہری ذرّے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وقت کا مختصر ہونا اس طرح نہیں جیسے کم حرکت پر چلنے والی وہ فلم جسے کوئی شخص دیکھ رہا ہو۔ ایسی ترکیب کے دوران جس میں وقت مختصر ہو جاتا ہے، دل دھڑکنے لگتا ہے، خلیوں کی گونج سنائی دیتی ہے، دماغ کام کرنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب زمین پر سست رفتاری سے چلنے والے انسان سے کہیں زیادہ سست رفتاری

سے چلتے ہیں۔ ایک شخص روزمرہ زندگی کے معمولات جاری رکھتا ہے اور اسے وقت کے مختصر ہو جانے کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ وقت کے اختصار کا پتہ ہی نہیں چلتا جب تک موازنہ نہ کیا جائے۔

قرآن اور نظریہ اضافیت

جدید سائنسی دریافتوں سے ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ وقت ایک مطلق حقیقت نہیں ہے جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں بلکہ یہ ایک اضافی ادراک ہے۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حقیقت سائنس نے بیسویں صدی میں دریافت کی لیکن قرآن نے چودہ صدیاں قبل اسے بنی نوعِ انسان تک پہنچا دیا تھا۔ اضافیت زماں کے بارے میں قرآن پاک میں کئی حوالے موجود ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ ہم اس سائنسی ثبوت والی حقیقت کو دیکھ سکیں کہ وقت ایک ایسا نفسیاتی ادراک ہے جس کا انحصار واقعات، ترکیب اور حالات پر ہے۔ اس کا ذکر قرآن حکیم کی بہت سی سورتوں میں آیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن بتاتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی بے حد مختصر ہے:

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۝

''جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں''۔ (سورۃ بنی اسرائیل:۵۲)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ط

''(آج یہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے''۔ (سورۃ یونس:۴۵)

چند قرآنی سورتوں میں اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ لوگ وقت کا ادراک مختلف طریقے سے کرتے ہیں اور کبھی کبھار تو وہ ایک مختصر سے وقت کو بڑا طویل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ذیل کی گفتگو جو یوم حشر لوگوں کے ساتھ ہوئی وہ اس کی ایک اچھی مثال ہے:

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝ قٰلَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝

''پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا، بتاؤ زمین میں تم کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ''ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے''۔ ارشاد ہوگا: ''تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہونا کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا''۔ (سورۃ المومنون:۱۱۴-۱۱۲)

چند دوسری آیات میں بتایا گیا ہے کہ وقت مختلف حالات میں مختلف رفتار سے بہے گا:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ط وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

''یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں، اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے''۔ (سورۃ الحج:۴۷)

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۔

''ملائکہ اور رُوح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔ (سورۃ المعارج:۴)

یہ تمام سورتیں اضافیت زماں کی تشریح کرتی ہیں۔ سائنس اس حقیقت کو بیسویں صدی میں سمجھ سکی جبکہ اللہ نے اسے ۱۴۰۰ سال قبل قرآن پاک میں بتا دیا تھا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قرآن اللہ نے نازل فرمایا اور وہی ذاتِ باری تعالیٰ زمان ومکان پر محیط ہے۔

قرآن پاک کی بہت سی دوسری سورتوں میں بتایا گیا ہے کہ زماں ایک ادراک ہے یہ بطور خاص قصص میں عیاں ہے۔ مثال کے طور پر اللہ نے اصحاب کہف کو غار کے اندر محفوظ رکھا، یہ ان ایمان والوں کا گروہ تھا جو قرآن کے مطابق ۳۰۰ سال سے زائد عرصے تک گہری نیند میں رہے۔ جب انہیں بیدار کیا گیا تو وہ سمجھے تھوڑی ہی دیر کے لئے سوئے تھے۔ وہ یہ اندازہ ہی نہ لگا سکے کہ وہ کتنے عرصے تک سوئے رہے تھے:

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۝

''تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لئے گہری نیند سلا دیا تھا پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے''۔ (سورۃ الکہف:۱۲-۱۱)

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَ لُوْا بَيْنَهُمْ ط قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ط قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ط

''اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انہیں اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گوچھ کریں، ان میں سے ایک نے پوچھا: ''کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟'' دوسروں نے کہا: ''شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے''۔ پھر وہ بولے: ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا''۔ (سورۃ الکہف:۱۹)

درج ذیل سورۃ میں جو صورت حال بتائی گئی ہے وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت ایک نفسیاتی ادراک ہے۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ج قَالَ اَنّٰى يُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ج فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ط قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ج وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

''یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا: ''یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟'' اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اس کو دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: ''بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟'' اس نے کہا: ''ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا''۔ فرمایا: ''تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں''۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔ (سورۃ البقرۃ:۲۵۹)

درج بالا آیت اس بات پر صاف صاف زور دیتی ہے کہ اللہ جس نے وقت تخلیق کیا، اس

نے اسے حدود کا پابند نہیں رکھا۔ دوسری طرف انسان وقت کا پابند بنا دیا جاتا ہے اور ایسا اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہے۔ انسان تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کتنی دیر نیند میں رہا۔ اس صورت حال میں یہ دعویٰ کرنا کہ وقت مطلق ہے (جیسا کہ مادہ پرست اپنی پراگندہ ذہنیت کے ساتھ کرتے ہیں) یہ نہایت غیر منطقی بات ہوگی۔

تقدیر

اضافیت زماں ایک نہایت اہم مسئلے کو واضح کر دیتی ہے۔ یہ اضافیت اتنی متنوع ہوتی ہے کہ ایک عرصۂ وقت جو ہمیں کئی بلین برسوں پر مشتمل نظر آتا ہے ایک اور جہت میں ایک واحد سیکنڈ میں گزر جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک وسیع وقت جو ابتدائے کائنات سے لے کر اس کے اختتام تک پھیلا ہوا ہے ایک دوسری جہت میں ممکن ہے یہ ایک سیکنڈ بلکہ ایک لمحے سے زیادہ نہ ہو۔

یہ نظریہ تقدیر کا نچوڑ ہے۔ جو ایک ایسا نظریہ ہے جسے بہت سے لوگ سمجھتے نہیں ہیں، خصوصاً وہ مادہ پرست جو اس سے مکمل انکار کرتے ہیں۔ تقدیر ماضی و مستقبل کے تمام واقعات کا مکمل علم ہے جسے اللہ کی ذات جانتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت یہ سوال کرتی ہے کہ جو واقعات ابھی پیش ہی نہیں آئے اللہ انہیں پہلے سے کیسے جان سکتا ہے اور یہ انہیں تقدیر کے استناد کو سمجھنے میں ناکام بنا دیتا ہے۔ تاہم وہ واقعات "جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے" وہ صرف ہمارے لئے وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ اللہ زمان و مکاں کا پابند نہیں ہے کیونکہ اس نے تو انہیں خود تخلیق کیا ہے اسی وجہ سے ماضی، مستقبل اور حال تمام اللہ کے لئے یکساں ہیں اس کے لئے ہر بات ہو چکی اور ختم ہو گئی ہے۔

لنکن بارنٹ اپنی کتاب "کائنات اور ڈاکٹر آئن سٹائن" میں اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ نظریہ عمومی اضافیت کیسے اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے: بارنٹ کے خیال میں اس کائنات کا "پوری شان و شوکت سے صرف ایک وسیع ذہانت کے ساتھ احاطہ کیا جا سکتا ہے" وہ مرضی و ارادہ جسے بارنٹ نے "وسیع ذہانت اور عقل و دانش" کا نام دیا ہے وہ اللہ کی دانائی اور علم ہے وہ ذات جو پوری کائنات پر محیط ہے۔ جس طرح ہم ایک حکمران کی حکومت کے آغاز، وسطی زمانے اور اختتام کو آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں اور ان کی درمیانی اکائیوں کو بھی مجموعی طور ہم دیکھتے ہیں اللہ اس وقت کو آغاز سے انتہا تک ایک واحد لمحے کی مانند جانتا ہے، جس کے ہم زندانی ہیں۔ لوگوں کو مختلف واقعات اپنے وقت پر پیش آتے ہیں اور اس وقت وہ اس تقدیر کو دیکھتے ہیں جو اللہ نے ان

کے لئے تخلیق کر دی ہے۔

معاشرے میں تقدیر کو سمجھنے کا جو مسخ شدہ تصوّر اپنی بہت محدود سی حقیقت کے ساتھ پایا جاتا ہے اس جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی بڑی ضرورت ہے۔ تقدیر کا یہ مسخ شدہ عقیدہ اس توہم پرستانہ عقیدے پر مشتمل ہے کہ اللہ نے ہر انسان کی ''تقدیر'' کا فیصلہ کر رکھا ہے مگر بعض اوقات لوگ ان کی تقدیر بدل بھی سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مریض جو موت کے منہ سے واپس آتا ہے اس کے بارے میں لوگ اس طرح کے سطحی بیانات دینا شروع کر دیتے ہیں ''اس نے تقدیر کو شکست دے دی ہے''۔ تاہم کوئی بھی اس کی تقدیر بدلنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ انسان جو موت کے منہ سے واپس آ گیا وہ صرف اس وجہ سے نہیں مرا کیونکہ اس وقت ابھی اس کی موت کا لمحہ نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ان لوگوں کی تقدیر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں: ''میں نے اپنی تقدیر کو شکست دی ہے'' ایسا کہنا ان کا مقدر ہوتا ہے اور ایسا ذہن رکھنا بھی ان کا مقدر ہوتا ہے۔

تقدیر اللہ کا ازلی وابدی علم ہے اور یہ اللہ کے لئے ہے جو وقت کو ایک واحد ثانیے کی مانند جانتا ہے، جو تمام زمان ومکاں پر حاوی ہے، ہر شے کا فیصلہ کر دیا گیا اور اسے تقدیر میں رکھ دیا گیا۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں یہ مذکور ہے کہ وقت اللہ کے لئے ایک ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں ہمارے ساتھ جو واقعات پیش آنے والے ہیں ان کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح کیا گیا ہے جیسے وہ وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں روز قیامت لوگوں کے اللہ کو حساب دینے کا ذکر ہے وہاں ان باتوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے یہ مدت ہوئی انہیں پیش آ چکی ہیں:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ۝ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۝ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا

اَبْوَابَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَo

''اوراس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکا یک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔ زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ کتاب اعمال لا کر رکھ دی جائے گی انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیئے جائیں گے۔ لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ (اس فیصلہ کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا، جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے''۔ (سورۃ الزمر:۷۲-۶۸)

اس موضوع پر قرآن پاک میں کچھ اور آیات بھی ہیں:

وَجَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَھَا سَآئِقٌ وَّشَھِیْدٌo

''ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کرلانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا''۔ (سورۃ ق:۲۱)

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَھِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاھِیَةٌo

''اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی''۔ (سورۃ الحاقۃ:۱۶)

وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰیo

''اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی''۔ (سورۃ النّٰزعٰت:۳۶)

فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَo

''آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں''۔ (سورۃ المطففین:۳۴)

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ مُّوَاقِعُوْھَا وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْھَا مَصْرِفًاo

''سارے مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے''۔ (سورۃ الکھف:۵۳)

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے واقعات جو ہماری موت (ہمارے نقطۂ نظر سے) کے بعد پیش آنے والے ہیں انہیں قرآن پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے جیسے وہ پیش آ چکے

ہوں اور ان کا تعلق ماضی سے ہو۔ اللہ تعالیٰ وقت کی اس اضافیت کے دائرہ کا پابند نہیں ہے، جس میں ہم پابند ہیں۔ اللہ نے ان چیزوں کا ارادہ لازمانیت میں فرمایا ہے: لوگ پہلے ہی انہیں سرانجام دے چکے ہیں اور یہ تمام واقعات وقوع پذیر ہو کر اختتام کو پہنچ چکے ہیں۔ ذیل کی سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ ہر واقعہ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اللہ کے علم میں ہے اور اس کا اندراج ایک کتاب میں ہو چکا ہے:

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

”اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے نہ چھوٹی نہ بڑی جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو“۔ (سورۃ یونس:۶۱)

مادہ پرستوں کی پریشانی

جن باتوں پر اس باب میں بحث کی گئی ان میں وہ سچائی جس پر مادے کی بنیاد ہے لازمانیت اور لامکانیت نہایت واضح اور صاف وشفاف طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کوئی ایسا فلسفہ یا طرز فکر نہیں ہے جو واضح وعیاں سچائیوں کی شکل میں موجود نہ ہو، جسے مسترد کرنا ناممکن ہے اس کے ایک فنی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ معقول اور منطقی ثبوت بھی اس مسئلے پر دیگر متبادلات کو تسلیم نہیں کرتا: یہ کائنات اس تمام مادے سمیت جو اسے تشکیل دے رہا ہے اور ان لوگوں سمیت جو اس میں بستے ہیں ایک خیالی وجود رکھتی ہے۔ یہ ادراکات کا مجموعہ ہے۔

مادہ پرستوں کے لئے اس مسئلے کو سمجھنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم پولائزر کی بس والی مثال کی طرف رخ کرتے ہیں: حالانکہ وہ فنی طور پر جانتا تھا کہ وہ اپنے قیاسات سے باہر قدم نہ رکھ سکتا تھا اسے تو مختلف وجوہ کی بنا پر اسے تسلیم کرنا ہی تھا۔ یعنی یہ کہ پولائزر کے خیال میں واقعات اس وقت تک دماغ میں وقوع پذیر ہوتے ہیں جب تک بس کا تصادم نہیں ہو جاتا مگر جونہی تصادم ہو جاتا ہے چیزیں دماغ میں سے نکل جاتی ہیں اور ایک طبعی حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس مقام پر منطقی نقص یہ رہ جاتا ہے: پولائزر نے بھی وہی غلطی کی ہے جو مادہ پرست

فلسفی جانسن سے سرزد ہوئی جس نے کہا کہ
''میں پتھر کو ٹھوکر مارتا ہوں، میرے پاؤں کو چوٹ لگتی ہے اس لئے یہ وجود رکھتا ہے''۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ بس کے حادثے کے بعد جو دھچکا محسوس کیا گیا وہ دراصل ایک ادراک بھی تھا۔
مادہ پرست اس موضوع کو کیوں نہیں سمجھ سکتے اس کا تحت الشعوری سبب یہ ہے کہ وہ اس بات سے خائف ہوتے ہیں کہ یہ حقیقت انہیں خوفزدہ کردے گی جب ان کی سمجھ میں آجائے گی۔
لنکن بارنٹ مطلع کرتا ہے کہ کچھ سائنسدانوں نے اس موضوع کو سمجھ لیا تھا:
''فلسفیوں نے جب تمام معروضی حقیقت کو کم کر کے قیاسات وادراکات کی ایک ظلی دنیا تک محدود کردیا تو سائنسدان انسانی حواس کی چونکا دینے والی حدود سے باخبر ہوگئے تھے۔''
کوئی بھی حوالہ جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ مادہ اور وقت ایک ایسا ادراک ہے جو ایک مادہ پرست میں خوف اور ڈر پیدا کردیتا ہے کیونکہ یہی وہ واحد خیال ہے جو اس کے ذہن میں بطور مطلق چیزوں کے آتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ انہیں بتوں کے طور پر تصور کرتا ہے جن کی پرستش کی جانی چاہئے؛ ایسا وہ اس لئے کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں اسے مادے اور وقت سے (بذریعہ ارتقاء) تخلیق کیا گیا ہے۔
جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جس کائنات میں وہ زندگی گزار رہا ہے وہ، یہ دنیا، اس کا اپنا جسم، دوسرے لوگ، دیگر مادہ پرست فلسفی جن کے نظریات نے اسے متاثر کیا ہے اور مختصراً یہ کہ ہر شے ایک ادراک ہے تو اس پر ان سب کی دہشت طاری ہوجاتی ہے۔ ہر وہ شے جس پر وہ انحصار کرتا ہے جس میں وہ یقین رکھتا ہے، اور جس میں وہ پناہ لیتا ہے یا جس کی طرف وہ رجوع کرتا ہے اچانک غائب ہوجاتی ہے۔ اسے مایوسی ہوتی ہے جو وہ لازمی طور پر یوم حساب محسوس کرے گا جس کا ذکر اس آیت میں یوں کیا گیا ہے:

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۨ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ٥

''اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افترا پردازیاں رفو چکر ہوجائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے''۔ (سورۃ النحل:۸۷)

اس کے بعد یہ مادہ پرست مادے کی حقیقت کے بارے میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس انجام کے لئے ''ثبوت'' پیدا کرتا ہے؛ وہ دیوار پر مکا مارتا ہے، پتھروں کو ٹھوکر لگاتا ہے، چیختا، چلاتا ہے مگر کسی طور حقیقت سے فرار نہیں ہوسکتا۔

جس طرح وہ اس حقیقت کو اپنے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے ہیں اسی طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسے مسترد کر دیں۔ وہ اس بات سے بھی باخبر ہیں کہ اگر مادے کی اصلیت سے عام لوگ واقف ہو گئے، انہیں ان کے اپنے فلسفے کا کہنہ پن اور عالمی نقطہ نظر سے ان کی بے خبری کا پتہ چل گیا تو یہ سب کے لئے ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ پھر کوئی ایسی بنیاد ان کے پاس باقی نہیں بچے گی جس پر وہ اپنے نظریات کی معقولیت پیش کر سکیں۔ یہ وہ خدشات ہیں جن کی بنا پر وہ اس حقیقت سے اس قدر پریشان ہیں جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ○

یوم حساب ان سے اللہ اس طرح مخاطب ہوگا: ”جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے؟“ (سورۃ الانعام: ۲۲)

اس کے بعد منکرین حق کے مال و دولت، اولاد، اور ان کے قریبی عزیز جن کو وہ اپنے حقیقی سمجھتے تھے اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے انہیں چھوڑ کر غائب ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اللہ نے اس حقیقت کو قرآن پاک کی اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

أُنظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○

”دیکھو اس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑیں گے اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو جائیں گے“۔ (سورۃ الانعام: ۲۴)

مومنین کی منفعت

جہاں یہ حقیقت مادہ پرستوں کو پریشان کر دیتی ہے کہ مادہ اور وقت ایک ادراک ہے اس کے برعکس یہ مومنین کے لئے اپنے اندر ایک سچائی رکھتی ہے۔ ایمان والے اس وقت بیحد خوش ہو جاتے ہیں جب انہیں مادے کے پیچھے چھپی حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقت تمام سوالات کی کنجی ہے۔ اس کلید سے تمام رازوں کے قفل کھولے جاتے ہیں۔ وہ بہت سی باتیں جنہیں سمجھنے میں کبھی ایک شخص کو دقت ہوتی تھی اب آسانی سے اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ اس قسم کے سوالات کہ موت، جنت، دوزخ،

آخرت، تبدیل ہونے والی جہتیں کیا ہیں؟ اور اس قسم کے اہم سوالات مثلاً ''اللہ کہاں ہے؟''، ''اللہ سے پہلے کیا تھا؟''، ''اللہ کو کس نے تخلیق کیا؟''، ''قبر کے اندر قیام کی مدت کتنی ہوگی؟''، ''جنت اور جہنم کہاں ہیں؟'' اور ''اس وقت جنت اور جہنم کہاں ہیں؟'' کا جواب بڑی آسانی کے ساتھ دیا جا سکے گا۔ یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اللہ کس نظام کے تحت اس پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔

یہاں تک کہ اس راز کے کھلنے کے ساتھ، ''کب'' اور ''کہاں'' کے سوالات بے معنی ہو جاتے ہیں اس لئے کہ کوئی زمان و مکاں باقی نہیں رہ جائیں گے۔ جب لامکانیت سمجھ میں آجاتی ہے تو یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ جہنم، جنت اور یہ زمین درحقیقت سب ایک ہی جگہ ہیں۔ اگر لازمانیت سمجھ میں آجائے تو یہ سمجھ میں آجائے گا کہ ہر چیز ایک واحد لمحے میں واقع ہوتی ہے، کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا پڑتا اور وقت گزر نہیں جاتا اس لئے کہ ہر بات پہلے ہی ہو چکی اور اختتام کو پہنچ چکی ہے۔

اس راز کی تحقیق ہو جائے تو مومن کے لئے یہ دنیا جنت نما بن جاتی ہے۔ تمام قسم کی مادی پریشانیاں، تفکرات اور ڈر غائب ہو جاتے ہیں۔ انسان اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی حاکم اعلیٰ ہے اور یہ کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اس پوری طبعی دنیا کو تبدیل کرتا ہے اور انسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور پھر پوری طرح اسی کے کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کردے۔

اس راز کو پالینا اس دنیا کی سب سے بڑی منفعت ہے۔ اس راز سے ایک اور بہت اہم حقیقت جس کا قرآن پاک میں ذکر آیا ہے ہم پر آشکار ہو جاتی ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔

''ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں''۔ (سورۃ ق:١٦)

جیسا کہ ہر انسان جانتا ہے کہ رگ گردن انسانی جسم کے اندر ہوتی ہے۔ تو پھر اس سے زیادہ اس سے قریب اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس صورت حال کی لامکانیت کی حقیقت کے ذریعے آسانی سے وضاحت کی جا سکتی ہے۔ اس راز کو سمجھنے کے بعد اس آیت قرآنی کو مزید بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک واضح سچائی ہے۔ اسے خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ اللہ سے زیادہ

انسان کا کوئی بھی معاون و مددگار، سہارا اور فراہم کنندہ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے سوائے اللہ کی ذات کے؛ وہی واحد ذات مطلق ہے جس کی پناہ ڈھونڈی جاسکتی ہے، جس سے مدد کی درخواست کی جاسکتی ہے اور انعام و اکرام کے لئے جس کی طرف نگاہ اٹھائی جاسکتی ہے۔

ہم جس سمت بھی رخ کریں اللہ ہی اللہ کو موجود پائیں گے۔

خلاصہ

بلاشبہ انسان کی تخلیق اور اس کے اپنے خالق کو جاننے سے زیادہ اہم بات اور کوئی نہیں ہے۔ اس پوری کتاب میں ہم نے اس موضوع کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو ہر انسان کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔

ہم اس مقام پر اپنے قاری کو یہ یاد کرانا چاہیں گے کہ اس کائنات، اور اس کی ہر شے، اور خود اس کو تخلیق کیا گیا ہے اور اسے سمجھنے کے لئے مکمل معلومات درکار نہیں ہے۔ یہ تو ایک چھوٹے سے بچے کے شعور اور استدلال کے اندر بھی اسی حد تک آسکتا ہے جس قدر ایک بالغ انسان کے شعور و استدلال میں کہ اسے تخلیق کیا گیا تھا۔ ہم جو کہنا چاہتے ہیں اس کی بہت اچھی مثال قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ سے دی گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جو پیغمبر خدا تھے، ایسی برادری میں رہتے تھے جو اللہ پر یقین نہیں رکھتی تھی اور ٹوٹم کے کھمبوں کی پرستش کرتی تھی (ٹوٹم سے مراد قدیم تہذیبوں کی رُو سے مظاہر فطرت میں سے کوئی چیز تھی عموماً کوئی جانور جسے ایک قبیلہ اپنے تشخص کا نشان قرار دیتا تھا)۔ آپ نے حالانکہ ابھی تک اللہ کے وجود کے بارے میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر اپنے استدلال اور شعور سے اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ ان کو کسی نے تخلیق کیا ہے۔ اور یہ کہ تخلیق کرنے والا اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا۔ قرآن پاک میں اسے یوں بیان فرمایا گیا ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَا كَوْكَبًا ج قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَo فَلَمَّا رَاالْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِىْ رَبِّىْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَo فَلَمَّا رَاالشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ ج فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَo اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَo

''چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے، مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اٹھا: ''اے برادران قوم میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''۔ (سورۃ الانعام: ۷۹-۷۶)

جیسا کہ ہم پیغمبر خدا حضرت ابراہیمؑ کی مثال میں دیکھتے ہیں ہر وہ انسان جو عقل و شعور اور استدلال رکھتا ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جو ''معصیت و خطا اور نخوت و تکبر سے اسے رد نہیں کرتا ہے وہ اس بات کو سمجھ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے اور مزید یہ کہ اسے ایک عظیم ترتیب و نظم اور منصوبہ بندی کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔

وہ لوگ جو استدلال اور عقل و شعور رکھتے ہیں ان کے لئے ایسے لوگوں کی حالت جو باوجود ان روشن نشانیوں کے جو ہر کسی کے دیکھنے کو موجود ہیں، اللہ کی موجودگی کو رد کر دیتے ہیں، بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کی قوتِ تخلیق میں یقین نہیں رکھتے ان کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ج وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ج وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o

''اب اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ ''جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے؟'' یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے''۔ (سورۃ الرعد: ۵)

اس کتاب میں جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ آپ کے لئے زندگی میں ہر شے سے زیادہ اہم ہیں۔ غالباً آپ اب تک اس موضوع کی اہمیت پر غور کرنے میں ناکام رہے ہیں یا شاید آپ

نے اس سے پہلے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ تاہم یقین کیجئے کہ اس اللہ کو پہچاننا جس نے آپ کو تخلیق کیا ہر اس کام سے زیادہ اہم اور لازمی ہے جسے آپ کر سکتے ہیں۔

اس نے جو جو کچھ آپ کو عطا کر رکھا ہے اس پر غور کیجئے: آپ اس دنیا میں رہتے ہیں جسے چھوٹی سی چھوٹی جزئیات سمیت نہایت فنکاری کے ساتھ بنایا گیا ہے اور اسے بطور خاص آپ کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس سارے عمل میں آپ کا تو کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایک روز آپ نے آنکھیں کھولی تھیں اور آپ نے دیکھا تھا کہ آپ لاتعداد نعمتوں کے درمیان موجود ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں......

اور ایسا اس لئے ہے کہ اس نے ایسی تخلیق کا ارادہ کیا تھا، اسے تخلیق کرنا چاہا تھا۔ ایک قرآنی آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ ۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

''اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیئے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے، اس لئے کہ تم شکر گزار بنو''۔ (سورۃ النحل: ۷۸)

جیسا کہ اس سورۃ میں بیان فرمایا اللہ کے سوا کوئی نہیں جس نے تمہیں ہر وہ شے دے رکھی ہے جو تمہارے پاس ہے اور جس نے وہ کائنات تخلیق کی جس میں تم رہتے ہو اس لئے آؤ اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور جو نعمتیں اس نے تمکو عطا کر رکھی ہیں ان کے لئے اس کے شکر گزار بن جاؤ اور ایسا کرنے سے ابدی انعام پاؤ۔ اگر تم نے اس کے برعکس کیا، ناشکر گزاری کا مظاہرہ کیا اور اپنے آپ کو سزا کے خطرے میں ڈال دیا تو وہ سزا اللہ کی مرضی ومنشا سے کبھی نہ ختم ہونے والی سزا بن جائے گی۔ یقین رکھو کہ وہ ضرور موجود ہے اور وہ ذاتِ بے ہمتا تمہارے بہت قریب ہے...... تو جو کچھ تم کرتے ہو اس کا اسے علم ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور وہ تمہارے لبوں سے نکلنے والا ایک ایک لفظ سنتا ہے......

اور اس پر یقین رکھو کہ جلد ہر ایک اسے حساب دے گا۔ تم بھی......

1. Staephen Hawking, *Evreni Kucaklayan Karinca*, Alkim Kitapçilik ve Yayincilik, 1993, s. 62-63.
2. A.g.e., s. 73.
3. *Bilim ve Teknik Dergisi*, say1 201, s. 16. (Science 84'ten çeviri)
4. Stephen Hawking, *A Brief History Of Time*, Bantam Press, London: 1988, s. 121-125.
5. A Dorling Kindersley Book - *The Science*, Published in the United States by Dorling Kindersley Inc., s. 24.
6. Stephen Hawking, *Evreni Kucaklayan Karinca*, Alkim Kitapçilik ve Yayincilik, 1993, s. 143.
7. *Bilim ve Teknik Dergisi*, say1.203, s. 25.
8. Büyük Larousse sözlük ve Ansiklopedisi, II. Cilt, s. 5734.
9. Marice Burton, C.B.P.C.Publishing Limited (Bates) Hayvanlar Ansiklopedisi, Sürüngenler, s. 120.
10. A.g.e., s. 120.
11. Micheal J. Behe, *Darwin's Black Box*, New York: Free Press, 1996, s. 32.
12. Grzimeks Tierleben Vögel 3, Deutscher Taschen Buch Verlag, Oktober 1993, s. 92.
13. A.g.e., s. 89.
14. A.g.e., s. 87-88.
15. David Attenborough, *The Private Life Of Plants*, Princeton University Press, 1995, s. 291.
16. *Nature Dergisi*, 12 Kasim 1981.
17. Michael Baigent, Richard Leigh, Henry Lincoln, *The Messianic Legacy*, Gorgi Books, London: 1991, s. 177-178.
18. D.M.S. Watson, "Adaptation", Nature, say1 124, s. 233.
19. Richard Levontin, "The Demon-Haunted World", The New York Review of Books, January 9, 1997. s. 28.
20. J.De Vries, *Essential of Physical Science*, Wm.B.Eermans Pub.Co., Grand Rapids, SD 1958, s. 15 (Issac Newton, Principia, II.Basim)
21. Timothy R. Stout, Tim Stout's Creation-Science Page, Chapter: Great Scientist Who Believed in a Creator God.
22. A.g.e.
23. Ümit Simsek, *Big Bang: Kainatin Gogusu*, s. 55.
24. David Daryling, *Deep Time*, 1990.
25. *Unravelling The Mind Of God*, s. 8 / Taskin Tuna, *Uzayin Ötesi*, s. 47.
26. *Bilim ve Teknik Dergisi*, Haziran 1997, s. 60.
27. Charles Darwin, *The Origin of Species: By Means of Natural Selection or the Preservation of Favoured Races in the Struggle for Life*, London: Senate Press, 1995, s. 134.

28. Derek A. Ager. "The Nature of the Fossils Record". Proceedings of the British Geological Association, vol. 87, no. 2, (1976), s. 133.
29. T. N. George. "Fossils in Evolutionary Perspective", Science Progress. vol. 48, (January 1960), s. 1, 3
30. Richard Monestarsky, *Mysteries of the Orient*, Discover, Nisan 1993, s. 40.
31. Stefan Begston, Nature 345:765 (1990).
32. Earnest A. Hooton, *Up From The Ape*, New York: McMillan, 1931 s. 332.
33. Stephen Jay Gould, *Smith Woodword's Folly*, New Scientist, 5 Nisan 1979, s. 44.
34. Charles E. Oxnard, *The Palce of Australopithecines in Human Evolution: Grounds for Doubt*, Natura, sayı 258, s. 389.
35. Richard Leakey, *The Making of Mankind*, London: Sphere Books 1981, s. 116.
36. Eric Trinkaus, *Hard Times Among the Neanderthals*, Natural History, sayı 87, Aralik 1978, s. 10; R. L. Holoway, "The Neanderthal Brain: What was primitive?", *American Journal of Physical Anthrophology Supplement*, sayı 12, 1991, s. 94.
37. Ali Demirsoy, *Kalitim ve Evrim*, Ankara: Meteksan Yayinlari 1984, s. 61.
38. Ibid.
39. *Fabbri Britannica Bilim Ansiklopedisi*, Cilt: 2, sayı 22, s. 519.
40. Kevin McKean, *Bilim ve Teknik*, (Discover'dan tercüme) sayı 189, s. 7.
41. Frank B. Salisbury, *Doubts about the Modern Synthetic Theory of Evolution*, s. 336.
42. Ali Demirsoy, *Kalitim ve Evrim*, Ankara: Meteksan Yayinlari 1984, s. 39.
43. Homer Jacobson, *Information, Reproduction and the Origin of Life*, American Scientist, Ocak 1955, s. 121.
44. Reinhard Junker, Siegfried Scherer, "Entstehung Gesiche Der Lebewesen". *Wegel*, 1986. s. 89.
45. Michael J. Behe, *Darwin's Black Box*, New York: Free Press, 1996, s. 232-233.
46. C. L., "Mason Aleyhtarligi", Mimar Sinan, Yil 4, sayı 13, 1973, s. 87-88.
47. Dr. Selami Isindag. "Olumlu Bilim-Aklin Engelleri ve masonluk". Mason Dergisi, yil 24, sayı 25-26 [Aralik 76-Mart 77].
48. Mimar Sinan, sayı 6, s. 66.
49. Mason Dergisi, Sayı 23-24, sayfa 41, 1976.
50. Michael Howard, The Occult Conspiracy: The Secret History Of Mystics, Templar, Mason and Occult Societies, 1.b., London: Rider, 1989, s. 63.
51. Frederic Vester. *Denken, Lernen, Vergessen*, 1991. s. 6
52. Ibid, s. 56
53. Francis Crick. *The Astonishing Hypothesis*, s. 35
54. Ibid, s. 36
55. Ibid, s. 118
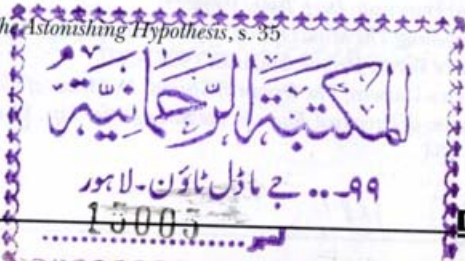
ہمیں اللہ کی موجودگی کا کیسے علم ہے؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں پایا جانے والا غیر معمولی توازن اور ربط محض اتفاق سے پیدا ہو گیا ہو جبکہ فطرت کا یہ بے مثال حسن ترتیب، موزونیت اور آہنگ اتنا واضح اور بدیہی ہے کہ برہنہ آنکھ سے بھی نظر آ سکتا ہے۔ یہ بات عقل وفہم سے کس قدر بعید ہوگی، اگر یہ کہا جائے کہ یہ کائنات جس کا ہر ہر گوشہ کسی ڈیزائنر کی طرف اشارہ کرتا ہے، خود بخود وجود میں آ گئی ہے۔

چنانچہ اس توازن، اس ہم آہنگی اور اس مطابقت کا، جس کے مناظر ہمارے جسم سے لے کر اس لامحدود کائنات کے بعید ترین حصوں تک پھیلے ہوئے ہیں، کوئی خالق لازما ہوگا۔ سو وہ کون خالق ہے جس نے تمام اشیاء پیدا کیں اور ایسے لطیف احکام اور نازک فرامین جاری کیے جن کے مطابق یہ نظام چل رہا ہے۔ وہ کوئی مادی پیکر تو نہیں ہو سکتا جو کائنات کے اندر موجود ہو۔ کیونکہ یقیناً وہ کائنات کی پیدائش سے پہلے موجود تھا اور اس کی مرضی اور مشیت کے مطابق کائنات تخلیق ہوئی۔ یہ تو وہ عظیم خالق ہے جس میں ہر شے اپنا وجود تلاش کرتی ہے اور خود اس کا وجود کسی ابتدا یا انتہا کے بغیر ہے۔

مذہب ہمیں ایسے ہی ایک پیدا کرنے والے کا پتہ دیتا ہے اور ہم اس بے مثال تخلیق کار کو اپنے مشاہدات اور فہم کے ذریعے تلاش کرتے ہیں۔ اس خالق نے جو کچھ ہمیں مذہب کے ذریعے بتلایا ہے اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہی کہ وہ اللہ ہے۔ رحمٰن اور رحیم اللہ۔ جس نے عدم وجود سے آسمان اور زمین پیدا کئے اور جو تمام اشیاء کا پیدا کرنے والا اور مالک ہے۔

یہ کتاب کائنات اور اس میں موجود اللہ کی تخلیقات سے متعلق غور وفکر کا دروازہ کھولتی ہے اور ان بے عیب اور مکمل ترین تخلیقات کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔